Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1971

غدّار کا انجام!

پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستانی — سالانہ ____ دس روپے غیر ممالک — سالانہ ____ ایک پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	ایک روپیہ
نمبر ۱۰	اکتوبر ۱۹۷۱ء	جلد ۲۴

فہرست

(۱) عدالتِ خداوندی کا فیصلہ ____ ۲

(۲) لمعات ____ ۳

(۳) طلوعِ اسلام کالج واحباب کالونی ____ ۷

(۴) اسلام اور سود پر ایک اجمالی نظر ____ (شاہد عادل) ____ ۸

(۵) کیا یہ واقعی شہید ہیں؟ ____ (محترم پرویز صاحب) ____ ۱۷

(۶) حقائق و عبر ____ (خدا کے لئے مظلوم اسلام پر رحم کیجئے) (ان کا شمار کن میں ہوگا؟) ____ (معرکۂ دین و وطن) (سفید ہاتھیوں کے کارنامے) (فساد کی چنگاری) (دو قومی نظریہ کا فریب) ____ ۴۰

(۷) تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت ____ (شاہد عادل) ____ ۴۶

(۸) ہمارا محبوب نظر ____ (محترم محمد اسلام صاحب) ____ ۴۹

(۹) شریعتِ اسلامی اور موسیقی ____ (محترم رفیع اللہ صاحب) ____ ۵۴ – ۶۰

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق، مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

عدالتِ خداوندی کا فیصلہ

إِنَّمَا جَزَاؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(٥ / ۳۳ ، ۳۴)

جو لوگ خدا اور رسول — یعنی اسلامی مملکت — کے خلاف بغاوت کریں یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا مخالف سمت سے انکے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ سزا اُن کیلئے اِس دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی۔ باقی رہی آخرت تو وہاں بھی اُن کیلئے سخت عذاب ہوگا۔

البتہ جو لوگ، قبل اسکے کہ تم اُن پر قابو پالو، اپنی اس روش سے از خود باز آجائیں تو اُن کیلئے قانونِ خداوندی میں معافی یا سزا میں رعایت کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ (دوسروں کیلئے نہیں)۔

(تحریر فرمودہ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

اگرچہ قوم قریب چھ ماہ سے عجیب بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا چلی آرہی ہے لیکن گزشتہ چند دنوں سے اس کی شدت خاص طور پر بڑھ گئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں کل (۱۸ ستمبر کی) شام کو صدر مملکت یحییٰ خان کی طرف سے ایک بیان نشر ہوا ہے جسے آج کے اخبارات نے شائع کیا ہے۔ چونکہ اب آئندہ (کم از کم کچھ وقت کے لئے) ملک کی سیاسی گفتگو اور حرکات و سکنات اسی محور کے گرد گردش کریں گی، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس بیان کو طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ بیان درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میرا ہمیشہ سے یہی مقصد رہا ہے کہ ملک کا آئین عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے تیار کرایا جائے۔ ۲۸ جون کو میں نے انتقالِ اقتدار سے متعلق اپنے منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے ملک کے لئے آئین تیار کرنے کے سلسلہ میں متعدد و متبادل طریقوں کا ذکر کیا تھا اور عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے آئین کی تیاری کا جمہوری طریقہ اختیار کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میرے اعلان کردہ اصل منصوبے کو مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات سے زبردست دھچکا لگا۔ ہمیشہ سے میرا یہی موقف رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے بحران کی وجہ سے ملک کو جو دھچکا لگا ہے اس سے عوام کے منتخب نمائندوں کو انتقالِ اقتدار کے متعلق میرا عزم متاثر نہیں ہوگا۔

اس سال ۲۸ جون کو میں نے اپنے بیان میں اعلان کیا تھا کہ ملک کے مشرقی بازو میں بحران نے تعطل پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ملک کے سیاسی راہنماؤں اور آئینی ماہرین کے مشورے سے ایک آئین تیار کرایا جائے جس میں آئین میں ترمیم کرنے سے متعلق معمول کے مطابق طریق کار رکھا جائے۔

تاہم اس مسئلہ پر گہرے غور و خوض اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ تفصیلی صلاح مشورے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے حکم پر مشتمل کمیٹی کے ذریعے تیار کیا جانے والا آئین قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے اور جب اسمبلی کا مکمل اجلاس منعقد ہو یعنی جب ضمنی انتخابات مکمل کرا لئے جائیں تو قومی اسمبلی آئین پر بحث کرے اور اگر کوئی رکن اسمبلی آئین کو بہتر بنانے کے سلسلے میں کوئی تعمیری تجویز پیش کرے تو اسے ایسا کرنے کا موقع دیا جائے۔ قومی اسمبلی کے ارکان کو اس قسم کی ترامیم پیش کرنے کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے میں نے ابتدائی تین ماہ کی مدت کے لئے ایک سادہ فارمولا اخذ کیا ہے۔ ایوان کو سادہ اکثریت سے آئین میں کوئی بھی ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا بشرطیکہ تمام وفاقی یونٹ اس ترمیم پر اتفاق رکھتے ہوں۔ اگر اوپر بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کوئی آئینی ترمیم قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد میرے سامنے پیش کی جائے اور میں قومی مفاد سے متعلق تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ایسی ترمیم کی منظوری دے دوں تو یہ ترمیم آئین کا حصہ بن جائے گی۔ اور اگر اس کے برعکس یہ محسوس کیا جائے کہ متعلقہ ترمیم قومی مفاد کی روشنی میں قابلِ قبول نہیں ہے تو اس ترمیم کو قومی اسمبلی کو دوبارہ غور کرنے

سکھنے کے واپس بھیجدیا جائے گا۔ اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ ترمیم کو تبدیلیوں کے بعد یا اصلی صورت میں دوبارہ میرے سامنے پیش کرے۔ اس مرحلے پر میں اس پر دوبارہ غور کروں گا اور اگر وہ ترمیم پھر بھی ناقابلِ قبول تھی تو میرے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں آئین میں مقرر کردہ ترمیمی طریق کار پر عمل کروں۔ اس طرح قومی اسمبلی کو آئین پر بحث کرنے اور ترامیم پیش کرنے کے لئے نوّے دن کی مہلت حاصل ہوگی۔ جب اسمبلی نوّے دن کی مقررہ مدت میں آئین پر پوری طرح بحث کرے گی تو آئین کی عبوری حیثیت ختم ہو جائیگی اور وہ اپنی آخری صورت اختیار کرلیگا۔ اس پورے طریق کار کے پیچھے کارفرما اصل مقصد یہ ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اس آئین کو بہتر بنا سکیں جو میں نے ایک کمیٹی کے ذریعے تیار کروایا ہے۔ آپ سب پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیئے کہ میں نے کسی لمحے کے لئے بھی یہ خواہش نہیں کی کہ میں خود ملک پر آئین مسلط کردوں۔ میں آج بھی ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔

ایک کمیٹی کے ذریعے آئین تیار کرانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس طرح انتقالِ اقتدار کے عمل کو تیز اور آسان بنایا جائے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ عوام کے منتخب نمائندوں کو اس کا پورا پورا موقع حاصل رہیگا کہ وہ آئین کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اس پر پوری طرح بحث اور غور و خوض کرلیں۔ میں پورے خلوص کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ صرف اسی طریق کار پر عمل کر کے ہی بحران کی سنگینیوں اور تقاضوں کو عوام کی ظاہر کردہ مرضی کے مطابق حل کیا جاسکتا ہے۔ آخر میں میں ایک مرتبہ پھر اس امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آئین میں کی جانے والی ترامیم ملک کی سالمیت، ایک جہتی اور اس نظریے سے جس پر پاکستان کی بنیاد قائم ہے متصادم نہ ہوئیں تو آئین میں کی جانے والی ترامیم بخوشی قبول کروں گا۔" (بحوالہ مساوات و پاکستان ٹائمز ۹ جون ۱۹۷۱)

کسی قوم کی اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی زندگی کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش ہو، اور وہ ایک قدم بھی جانبِ ساحل نہ بڑھے۔ قطع نظر دیگر امور، ہم دستور سازی کے معاملے میں آج بھی وہاں ہیں جہاں ۲۴ سال پہلے تھے اور موجودہ عسکری نظام کی تمام تگ و تاز کے باوجود اس وقت پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں سے ایک سال پہلے ہم نے آغازِ سفر کیا تھا۔ صدر یحییٰ کے اس اعلان سے ایک متعین پروگرام پھر سامنے آیا ہے۔ لیکن سالِ گزشتہ کا پروگرام اس سے کچھ کم متعین نہیں تھا۔ قوم نے جس طرح اس کی دھجیاں بکھیریں، اسی کے نتیجہ میں اس پروگرام کو از سرِ نو مرتب کرنا پڑا۔ ابھی ضمنی انتخابات ہونگے، اس کے بعد مجلسِ دستور ساز متشکل ہوگی، پھر صدر یحییٰ کا مرتب کردہ مسودہ آئین اسمبلی کے سامنے پیش ہوگا۔ تین مہینے تک وہ ترامیم کے مراحل سے گزریگا۔ یہ سب کچھ خیر خیریت سے ہو جائے تو پھر کہیں جا کر اس کی عبوری حیثیت بدلے گی۔ یہ غنیمت ہے کہ اس دفعہ ترامیم کے لئے ہر صوبہ کا الگ الگ اتفاق ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے کم از کم اس حد تک مشرقی پاکستان کی وہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے جو مساوات (PARITY) سے پیدا ہو گئی تھی۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ سترہ دسمبر ۱۹۷۰ء کی شام کو جب انتخابات کے نتائج نے جماعتِ اسلامی کو انتہائی غیر متوقع دھچکا دیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا کہ ان انتخابات کو کالعدم قرار پا جانا چاہیئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس جماعت نے کیا کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل تو کوئی آنے والا مؤرخ ہی بتا سکیگا بشرطیکہ اسکے پاس حوادث کی سطح سے بہت نیچے اتر جانے کے ذرائع موجود ہوئے۔ لیکن یہ امر موجبِ ہزار اطمینان ہے کہ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے، یہ حضرات (اور ان کے ساتھ دیگر شکست خوردہ عناصر) اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ صدرِ مملکت نے جس پامردی اور بلند حوصلگی سے ان کی بے پناہ سازشوں کا مقابلہ کیا ہے اس کے لئے ہم انہیں مستحقِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اب جماعتِ اسلامی کی ساری توجہات مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات پر مرکوز ہوں گی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اس بازو میں اس جماعت کے ہزاروں کی تعداد میں مسلح رضاکار تیار ہو چکے ہیں تو یہ

جماعت ان کے ذریعہ انتخابات پر جس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ مجیب کے پاس بھی تو سب سے مؤثر حربہ ایسا ہی تھا۔ ہمیں امید ہے کہ سابقہ تجربہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارا عسکری نظام اس کے سدِباب کے لئے پورے پورے انتظامات کرے گا۔ خدا کرے وہاں کے انتخابات کا یہ مرحلہ بخیر و خوبی گزر جائے ورنہ گزشتہ حوادث نے تو قوم کی کیفیت یہ کر دی ہے کہ

می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

ہر چند ہمیں (عوامی لیگ کے مفلوج ہو جانے کے بعد) کسی اور جماعت سے اس قسم کے خطرات کا اندیشہ نہیں لیکن باایں ہمہ، ہم ہر ایک پارٹی سے درخواست کریں گے کہ وہ نہ کسی کو کسی قسم کا اشتعال دلائے نہ کسی کے اشتعال کا اثر لے۔ اور ان تمام مراحل کو امن و امان سے تکمیل تک پہنچنے دیں۔ اب تو جسدِ ملت زخموں سے اس قدر چور چور ہو چکا ہے کہ اس میں کسی قسم کا مزید دھچکا برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

(۲)

ہماری رائے میں مغربی پاکستان میں بھی اسی انداز سے عبوری حکومتیں قائم کر دینی چاہئیں جس انداز سے مشرقی پاکستان میں قائم کی گئی ہے۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ یہاں کی حکومتوں میں آسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کے تناسب کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اس بازو میں پیپلز پارٹی کی حیثیت بزرگ خاندان کی سی ہے۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ جو پارٹیاں بھی ان سے تعاون کا ہاتھ بڑھائیں آپ ان سے بزرگانہ شفقت سے پیش آئیں اور اپنی وسعتِ ظرف کا مظاہرہ کریں۔

مدارِ جلوہ دریغ از دلم کہ تر حسن ٭ زخوش جلیئی آئینہ کم نمی گردد

ہماری دوسری درخواست ان سے یہ ہے کہ جب تک عسکری نظام قائم ہے یہ اس سے پورا پورا تعاون کریں۔ ملک بے حد نازک دور سے گزر رہا ہے اور دشمنوں کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوتی ہیں کہ ہم میں کہیں ذرا سا بھی اختلاف و افتراق نمودار ہو، تو وہ جھپٹا ماریں۔ خود ملک کے اندر بھی اس قسم کے عناصر کی کمی نہیں جو بہی خواہیٔ ملت، انسانی ہمدردی اور تحفظِ اسلام کے پردے میں قوم میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے ہیں۔ یہ تو عام حالات کی بات ہے، اگر خدا نکردہ بھارت نے جنگ چھیڑ دی تو پھر ہم ملک کی چھوٹی بڑی تمام جماعتوں سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے مطالبات کو بالائے طاق رکھ کر ایک بنیان مرصوص کی طرح حکومت کے ساتھ صف بستہ کھڑے ہو جائیں کہ ہمارے مطالبات کی تکمیل تو ایک طرف خود ہماری زندگی کا انحصار پاکستان کی سلامتی اور بقا پر ہے۔

اگر مغربی بازو میں بھی سول حکومتیں قائم ہو گئیں تو پیپلز پارٹی کے سر پر جو گراں بار ذمہ داریاں عاید ہو جائیں گی اُن کا اس جماعت کو پورا پورا احساس کرنا چاہیئے۔ جنگ کے متعلق تو بھارت کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ "زنانیوں کی کھیل" نہیں ہوتی۔ لیکن ہم آج یہ کہیں گے کہ بحالاتِ موجودہ ملک میں حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس باب میں پیپلز پارٹی کی ذمہ داریاں اور بھی زیادہ گراں بار ہو جاتی ہیں کیونکہ انہوں نے عوام سے اس قدر خوش کن وعدے کر رکھے ہیں کہ ان کا بعجلت پورا کرنا کسی حکومت کے بس کی بھی بات نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اس پارٹی کو معلوم ہے، خود اس کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جنہوں نے ابھی سے عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرنا شروع کر رکھا ہے کہ یہ پارٹی اپنے وعدوں کو کبھی پورا نہیں کر سکیگی۔ اس وقت تو اس پارٹی کے پاس یہ عذر موجود ہے کہ ہمارے پاس اختیارات ہی نہیں اس لئے ہمارے وعدے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب اختیارات بھی ان کے ہاتھ میں آ گئے تو پھر ان کے پاس عوام کی سنگباری سے بچنے کے لئے کوئی سپر نہیں ہوگی۔ اس کے لئے انہیں

سب سے پہلے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ انہیں اپنی زندگی کو عوام کی سطح پر لانا ہوگا۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا پڑے گا۔ ایسی کیفیت پیدا کرنی ہوگی کہ عوام کو اس کا احساس ہوجائے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے ہیں اور جو کچھ ہم پر بیتتی ہے ان پر بھی وہی کچھ بیتتی ہے۔ انہیں عملاً یہ کر کے دکھانا ہوگا کہ "عمر گیہوں کی روٹی اس وقت کھائے گا جب اسے یقین ہوجائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے"۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو اس سے ملک میں جو خلفشار پیدا ہوگا اس کے تصور سے ہماری روح کانپتی ہے۔ خدا انہیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ یہ اپنے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکیں اور اس طرح ملک کو اس قسم کی تباہی سے بچا لیں۔

اس پارٹی کی دوسری کمزوری پختہ کار سیاستدانوں کی کمی ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اگر انہیں اختیارات حاصل ہوجائیں تو یہ تشکیلِ حکومت کو اپنی پارٹی کے اراکین تک محدود نہ رکھیں۔ ملک میں ایسے مخلص، پختہ کار، متحمل مزاج، اربابِ سیاست و تدبر کی کمی نہیں جن کا تعلق کسی پارٹی سے نہیں۔ اگر یہ حضرات اس قسم کے حضرات کو اپنے ساتھ شامل کر لیں گے تو اس سے خود ان کی پارٹی کو بھی بڑی تقویت پہنچے گی اور قوم اور ملک کے لئے بھی یہ اقدام بڑا منفعت بخش ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی پارٹی کے اندر سے اس قسم کے اقدام کی مخالفت ہوگی، کیونکہ ان میں بیشتر عنصر ایسا ہے جو محض محمل لیلےٰ تک رسائی کے لئے ان کا شریکِ کارواں ہے وہ اسے بمشکل برداشت کر سکیں گے کہ ان کے متوقع مالِ غنیمت میں کوئی اور شریک ہوجائے۔ اس مقام پر پارٹی کے ذمہ دار ارکان کے تدبر کا بڑا کٹھن امتحان ہوگا۔

———(०)———

(۲)

۵ ستمبر کی صبح وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں شہدائے پاکستان کی یاد میں "بزمِ طلوعِ اسلام لاہور" کے زیرِ اہتمام ایک پبلک جلسہ منعقد ہوا جس کا اعلان طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کیا گیا تھا۔ معمول کے مطابق تو اجتماع جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے شہداء کی یاد ہی میں تھا۔ لیکن، چونکہ ہمارے نزدیک اُن شہدائے ملت کی عظمت بھی کچھ کم نہیں جنہوں نے مارچ۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی ہنگامہ خیزیوں میں اپنی جانیں دے کر ملک کو بچا لیا، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ اس اجتماع میں ان کی یاد کو بھی تازہ کیا جائے۔ یہ اجتماع بڑا پُر گداز اور کامیاب تھا۔ انتظامیہ کی طرف سے عاید کردہ پابندیوں کی بنا پر نشستوں کو ہال کے اندر محدود رکھنا پڑا جو آغازِ اجلاس سے بہت پہلے پُر ہوگئیں اور صدہا شائقین کو جگہ کی قلت کی وجہ سے باصد حسرت و یاس ناکام لوٹنا پڑا۔ ناظم ادارہ مرزا محمد خلیل کی تلاوتِ قرآن کریم اور کلامِ اقبال کے بعد محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب کی حسنِ صدارت میں پرویز صاحب کے خطاب کا آغاز ہوا۔ قریب دو گھنٹے پر مشتمل یہ خطاب ذوق و شوق اور سوز و گداز کا ایسا پُر تاثیر مرقع تھا کہ اس کی یاد برسوں تک بھلائی نہیں جاسکے گی۔ یہ خطاب آئندہ صفحات پر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ تقریر اور تحریر میں جو فرق ہوسکتا ہے، اس کے باوجود امید ہے قارئین اس کی جامعیت اور تاثر کو پوری طرح محسوس کریں گے۔ خطاب کے دوران ایک حقیقت کا خاص طور پر انکشاف ہوا جب پرویز صاحب اس مقام پر پہنچے جہاں انہوں نے مارچ ۱۹۷۱ء کے سرفروشوں کے متعلق کہا کہ ان کے نام تک سے بھی کوئی واقف نہیں، تو سامعین کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں اور دیر تک ہچکیوں کی صدائے دردناک سے فضا متاثر رہی۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ قوم نے اس جانگداز صدمے کے اثرات کو کس سختی سے اپنے سینے میں دبائے رکھا ہے اور وہ کس شدت سے اس انتظار میں ہے کہ یہ آہیں، نوحہ بن کر ان کے سینے سے باہر آئیں۔ اس موقع پر ہمیں تاریخ کا وہ واقعہ

یاد آگیا کہ جنگ بدر میں شکست کھا جانے کے بعد قریش نے اپنی غیرت کی وجہ سے یہ منادی کرا دی کہ مکہ میں کوئی شخص اپنے مقتولین پر نوحہ نہ کرے۔ اس لڑائی میں قریش کے ایک سردار اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے۔ اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا لیکن قوم کے فیصلہ کی وجہ سے وہ رو نہیں سکتا تھا۔ ایک دن اس کے کان میں دور سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید نوحہ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے نوکر کو دوڑایا کہ پتہ لائے۔ اس نے آکر کہا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے وہ اس کے لئے رو رہی ہے۔ یہ سنکر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور بے ساختہ اس کی زبان سے چند اشعار نکلے جس میں اس نے کہا کہ قسمت نے ہمیں یہ دن بھی دکھانے تھے کہ ایک بدو عورت کو اونٹ کی گمگشتگی پر تو رونے کی اجازت ہے لیکن اسود کو بیٹوں کی موت پر رونے کی اجازت نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مجیب کے انجام کی خبر قوم کو اپنے شہداء کی یاد میں آنسو بہانے کی اجازت کے مرادف ہوگی۔ اسی لئے وہ اس کا شدت سے انتظار کر رہی ہے۔ یاد رکھئے کہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مرگ تو اہل جہاں را زندگی است　　　(۱۹ ستمبر ۱۹۷۱ء)

(✻)

طلوعِ اسلام کالج و احباب کالونی

قرآنی فکر سے ہم آہنگ حضرات مجوزہ طلوع اسلام کالج سے کس قدر دلچسپی رکھتے ہیں اس کا اندازہ ان استفسارات سے ہو سکتا ہے جو ہمیں اس ضمن میں مسلسل موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان حضرات کی اطلاع کے لئے عرض کر دیا جائے کہ اس مقصد کے لئے جو زمین شروع میں منتخب کی گئی تھی اب اسے حکومت کے توسط سے خریدا جا رہا ہے۔ اس کا زرِ ثمن حکومت کے خزانہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اب امید ہے کہ ضابطہ کی کارروائی کی تکمیل کے بعد یہ اراضی ہمارے نام منتقل ہو جائے گی۔ اس رقبہ کے ایک حصہ میں طلوع اسلام کالج کی تعمیر ہوگی اور دوسرے حصہ میں احباب کوآپریٹو سوسائٹی کی بستی بسائی جائے گی۔

اکثر احباب نے طلوع اسلام کالج کے لئے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو عطیات دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ ان وعدوں کا ایفا اراضی کی خریداری کے وقت کیا جائے گا۔ ہم نے ان احباب کی خدمت میں یاد دہانی کے خطوط لکھے تھے ان میں سے بعض خطوط واپس آگئے ہیں جس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان احباب کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔

اسی طرح احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے اراکین کے نام بھی خطوط لکھے گئے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ وہ پلاٹ کی خریداری کے لئے مجوزہ رقم جلد از جلد بھیج دیں۔ ان میں سے بھی بعض خطوط واپس آگئے ہیں۔

جن احباب تک ہماری یہ چٹھیاں نہ پہنچی ہوں ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ ہم سے جلد از جلد رابطہ قائم کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کے لاپتہ ہونے کی وجہ سے انکے نام سوسائٹی کی رکنیت سے خارج کر دینے پڑیں اور وہ مکان کی تعمیر کے لئے پلاٹ حاصل نہ کر سکیں۔

والسلام

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵ - بی گلبرگ - لاہور　　　سیکرٹری احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ ۲۵ بی گلبرگ لاہور

نقد و نظر

شاہد عادلی

"اسلام اور سود" پر ایک اجمالی نظر[1]

اہلِ مغرب نے جب مسلمانوں پر سیاسی برتری حاصل کر لی تو رفتہ رفتہ ان کا سرمایہ داری نظام ان پر مسلط ہو گیا۔ اس نظام کی بنیاد سود پر تھی جو اسلام میں جرمِ عظیم شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی زوال کی وجہ سے نظامِ سرمایہ داری کو تو کسی نہ کسی صورت میں قبول کر لیا گیا۔ لیکن سود کا معاملہ سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا ہی رہا کہ نہ اسے نکالا جا سکتا تھا اور نہ ہی اُگلا جا سکتا۔ مختلف اسلامی ممالک میں کئی علماء آگے بڑھے اور انہوں نے اس جرمِ عظیم کے جواز کے فتوے صادر فرما دینے میں کوئی قباحت محسوس نہ کی۔ ہو سکتا تھا کہ دن بدن ان فتاویٰ کی تائید ہوتی چلی جاتی لیکن اسی دوران سرمایہ داری کی مخالفت میں ایک نئے نظام یعنی سوشلزم نے جنم لیا۔ جس نے عملاً بغیر سود کے معاشرہ قائم کر دکھایا۔ اب مسلمان تو ایک طرف، کینز (KEYNES) جیسے سرمایہ دار ماہرِ معاشیات بھی سود کی مخالفت کرنے لگے۔ اس صورتِ حالات کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر سود کی سخت مخالفت ہونے لگی۔ لیکن چونکہ اس مخالفت میں نظامِ سرمایہ داری کے ساتھ سمجھوتہ بھی شامل تھا اس لئے سود کی یہ مخالفت صرف بنک کے سود تک محدود رہی۔ سود کی تمام دوسری اقسام کا 'جن کی' شریعتِ اسلامیہ میں 'واضح حرمت موجود ہے' اول تو نام ہی نہ لیا گیا اور اگر لیا گیا تو اس کے جواز کا فیصلہ صادر فرما دیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب بھی تقریباً اسی زمرے میں شامل ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب ہمارے ملک کے مشہور ماہرِ معاشیات ہیں۔ جو ماضی قریب تک حکومتِ پاکستان کے مالی مشیر رہے ہیں۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں ان کا شمار برِ صغیر ہند و پاک کے چوٹی کے معاشیین میں ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۸۹) ایسی ہستی کا حرمتِ سود کا نظریہ لے کر آگے بڑھنا امتِ مسلمہ کے لئے یقیناً خوش قسمتی کی علامت ہے۔ آپ نے کتاب کے پہلے ہی باب میں مغربی ماہرینِ معاشیات کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ کس طرح سود ہر سوسائٹی کے لئے لعنت ہے اور یہ کہ جس معاشرے سے اس کا وجود ختم کر دیا جاتا ہے وہ خوشحال ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۹۵) اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بلا سود بنکاری کا ایک نقشہ بھی پیش کیا ہے اور ملکی معاشیات کے مؤثر کنٹرول کے لئے بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کی ضرورت اور اس کے طریقِ کار کے لئے ایک پورا باب قلمبند فرمایا ہے (صفحہ ۲۸۳) لیکن چونکہ یہ سب کچھ آپ نے سرمایہ داری کی چار دیواری میں کھڑے ہو کر کیا ہے اس لئے بعض اوقات شرعی احکامات کے غلط مفہوم اور استعمال نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک جدید علمِ معاشیات کا تعلق ہے اس کی بابت تو ہم کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ فاضل مصنف کا شمار چوٹی کے معاشی ماہرین میں ہوتا ہے۔ لیکن جہاں انہوں نے شریعتِ اسلام کے ماہر ہونے کی بھی کوشش فرمائی ہے' اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ہم

---

[1] مصنف ڈاکٹر انور اقبال قریشی شائع کردہ حانیہ پبلشنگ ہاؤس لاہور چھاؤنی۔ صفحات ۳۱۶۔ قیمت مجلد دس روپے۔

ضرور جسارت کریں گے۔

سود اور مضاربت

فاضل مصنف سودی نظام کو "مسلمان بنانے" کے لئے کوئی شرعی دلیل دیئے بغیر فرماتے ہیں:

"اسلام نے منافع اور ایسی شراکت کو جس میں نفع اور نقصان دونوں کی ذمہ داری ہر شریک پر ہو جائز قرار دیا ہے۔" (صفحہ ۹۱)

پھر لکھتے ہیں:-

"اسلام سود کی ممانعت کرتا ہے لیکن منافع اور شراکت کو جائز قرار دیتا ہے۔ بنک اگر صنعتوں کو قرضہ دینے کی بجائے ان کے حصہ دار بن جائیں اور ان کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک رہیں تو پھر ایسے بنکوں کے خلاف اسلامی نظام میں کوئی اعتراض نہیں۔" (صفحہ ۲۱۴-۲۱۵)

آگے چل کر ایک اور مقام پر پھر یہی بات دھراتے ہیں:-

"لیکن اگر روپیہ قرض دیا جائے اور نفع و نقصان کو باہمی طور پر تقسیم کرنے کا معاہدہ کر لیا جائے تو یہ مثال کاروباری شراکت کی ہے اور اسلام اس کی نمایاں طور پر ترغیب دیتا ہے۔" (صفحہ ۲۷۷)

اور آخر میں یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ "اسلامی نظام میں بنک نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوں گے۔" (صفحہ ۳۰۹)

مصنف نے اتنے اہم شرعی احکامات کا کوئی ایک حوالہ بھی نہیں دیا۔ وہ بار بار جس شراکت کا ذکر کر رہے ہیں اسلامی قانون کی اصطلاح میں اسے مضاربت کا نام دیا جاتا ہے۔ شراکت اور مضاربت میں ایک واضح فرق ہے۔ شراکت میں تمام شرکاء کا سرمایہ بھی ہوتا ہے اور وہ سب مل کر کاروبار کرتے ہیں مگر مضاربت میں ایک فریق سرمایہ لگاتا ہے اور دوسرا کام کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر انہوں نے اسی مقصد کے لئے شراکت کی بجائے مضاربت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ انہی کی زبانی سنیئے:

"یہی صحیح اسلامی سپرٹ ہے جو کہ کاروبار میں روپیہ لگائے، اس کی نوعیت مضاربت کی ہو اور وہ نفع و نقصان دونوں میں برابر کا شریک ہو۔" (صفحہ ۳۱۰)

مضاربت کے مفہوم سے ناآشنائی

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ سرمایہ داری جیسے اہم نظام کی بنیاد یعنی بنکاری کو مسلمان بنانے والے چاہے وہ "مفکر اسلام" ہوں یا چوٹی کے معاشی ماہرین جس اصطلاح کا سہارا لیتے ہیں اس کی صحیح تعریف تک سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہ حضرات جہاں بھی اس اصول کا ذکر فرماتے ہیں اس کا مفہوم نفع و نقصان میں شرکت بتاتے ہیں۔ اسلئے ہم نے فاضل مصنف کے ان الفاظ کو ہر جگہ خط کشیدہ کر دیا ہے۔

مضاربت کا صحیح مفہوم

آیئے اب اسلامی قانون کی معتبر کتابوں میں مضاربت کی اصطلاح کی صحیح تعریف ملاحظہ فرمایئے۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم صرف وہی تعریف پیش کرتے ہیں جو اہلسنت کے چاروں ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ وہ یہ ہے:-

هي في اللغة عبارةٌ أن يدفع شخص مالاً للآخر ليتجر على ان يكون الربح بينهما على ما شرطا و الخسارة على صاحب المال۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۳ صفحہ ۳۴)

(ترجمہ) مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو تجارت کے لئے مال دے کہ نفع تو ان میں شرائط کے مطابق تقسیم ہو اور نقصان صرف صاحب مال کے ذمہ ہوگا۔

مضاربت کی اس تعریف پر صرف چاروں ائمہ ہی کا اتفاق نہیں بلکہ اثنا عشری فرقہ بھی اس سے متفق ہے۔ جناب ابو الحسن مضاربت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الربح بینھما و الوضیعہ علی المال۔ (الاستبصار فیما اختلف من الاخبار للطوسی جلد ۳ ص ۱۲۶)

(ترجمہ) یعنی نفع میں تو دونوں شریک ہونگے۔ لیکن نقصان مال پر ہوگا۔

کتنی واضح بات ہے کہ مضاربت کے اصول پر کاروبار کرنے والے دونوں فریق صرف نفع میں شریک ہونگے اور نقصان تمام کا تمام صاحب سرمایہ کے ذمہ ہوگا۔ کارندہ کو نقصان کی صورت میں کچھ بھی نہ دینا ہوگا۔ بلکہ الٹا اس کے سفر کے اخراجات سرمایہ ہی سے وضع کئے جائیں گے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:۔

و نفقة العامل من المال فی سفرہ من طعامہ و کسوتہ و ما یصلحہ بالمعروف بقدر المال۔

(موطا امام مالک۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۸۸)

(ترجمہ) کام کرنے والے حصہ دار کا سفر خرچ مثلاً کھانا، کپڑے اور دوسری معروف چیزیں سرمایہ سے اس کی مقدار کو سامنے رکھتے ہوئے لی جائیں گی۔

مضاربت کی شرعی حیثیت

یہ تو ہوئی مضاربت کی صحیح تعریف۔ اب فاضل مصنف کا یہ فرمان ملاحظہ ہو کہ "اسلام اس معاملے کی نمایاں طور پر ترغیب دیتا ہے (ص ۲۶۶)" لیکن آپ نے حسب دستور اس نمایاں ترغیب کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی۔ حالانکہ اس کی نمایاں ترغیب تو کجا ائمہ فقہ کے نزدیک سرے سے اس کی مشروعیت ہی مشکوک ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں:۔

قال ابن حزم فی مراتب الاجماع کل ابواب الفقہ فیھا اصل من الکتاب والسنة حاشا القراض فما وجدنا لہ اصلاً فیھا البتة۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۵۔ ص ۲۶۳)

(ترجمہ) امام ابن حزم مراتب الاجماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کے ہر باب کی اصل کتاب و سنت میں ہے۔ لیکن مضاربت کی کوئی اصل ہم نے کتاب و سنت میں نہیں پائی۔

اس لئے جن فقہا نے اس کی اجازت دی ہے وہ صرف مجبوری کی حالت میں اور وہ بھی بڑے محدود پیمانے پر۔ انہوں نے اسے نظام سرمایہ داری کو مسلمان بنانے کا ذریعہ ہرگز قرار نہیں دیا۔ اس سلسلے میں دوسرے مذاہب کی تفصیلات بیان کرنے کی بجائے ہم حنفی مسلک ہی پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مشہور حنفی امام شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:۔

ان بالناس حاجة الی عقد المضاربة۔ فصاحب المال قد یکون عاجزاً عن التصرف بنفسہ۔ (المبسوط جلد ۲۲ ک)

(ترجمہ) لوگ مضاربت پر کام کرانے کے محتاج ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات صاحب مال خود کاروبار کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ اس معاملے کی اجازت صرف اسی صورت میں دی جا رہی ہے جب صاحب مال اپنے مال سے خود کاروبار کرنے کے قابل نہ رہے۔

مضاربت کے غلط مفہوم کی ابتداء

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے چوٹی کے ماہرین معاشیات جب اسلامی احکام کی بات کرتے ہیں تو صرف سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ مضاربت ایسی اہم اصطلاح جس کا سہارا لے کر وہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد یعنی بنک کے سود کو مسلمان بنا لیتے ہیں

ہیں کی بذاتِ خود تحقیق فرمالیں۔ اب دیکھئے کہ اس غلط مفہوم کی بنیاد کہاں سے پڑی۔ سرمایہ داری کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے صرف بنک کے سود کی مخالفت کرنے والوں میں امیر جماعتِ اسلامی جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی شامل ہیں جنہیں جماعتِ اسلامی کے رسائل و جرائد میں "مفکرِ اسلام" کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مضاربت کی جو تعریف بیان کی تھی وہ انہی کی زبان سے سنیئے :۔

"اسلامی قانون نے تجارت، صنعت اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع و نقصان کی شراکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ تو اس سے کاروبار کر، نفع و نقصان میں آدھے یا چوتھائی کا میں شریک ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا سرمایہ کسی عمارت کی شکل میں دے سکتا ہے۔ اور کہہ سکتا ہے کہ تو اس میں کام کر۔ نفع و نقصان میں میرا اتنا حصہ ہے۔" (مسئلہ ملکیت زمین۔ دوسرا ایڈیشن۔ صفحہ ۸۵)

اس کی تائید میں مودودی صاحب کے کچھ دوسرے اقتباسات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم صرف اس پر اسلئے اکتفا کرتے ہیں کہ آگے چل کر وہ اس میں عجیب ہاتھ کی صفائی دکھلاتے ہیں اور اسی وجہ سے متعلقہ مقامات ہم نے خط کشیدہ کر دیئے ہیں۔

پہلی مرتبہ جب راقم نے "عالمِ اسلام کے اس بلند پایہ مفکر" کی زبانی مضاربت کی یہ تعریف دیکھی تو مجھے رونا بھی آیا اور ہنسی بھی۔ رونا اس بات پر کہ اس قوم کی علمی کم مائیگی اور فکری دیوالیہ پن کا کیا حال ہوگا جس کے بلند پایہ مفکر کی یہ حالت ہے کہ وہ جس اصطلاح کا سہارا لے کر نظامِ سرمایہ داری کا جواز ڈھونڈ رہے ہیں، اس کی صحیح تعریف تک سے آگاہ نہیں ہیں، اور ہنسی ان کے اس دعویٰ پر کہ "ہم نے اپنی زندگی دین کے سمجھنے میں وقف کر دی ہے۔ ہم نے اسلام کے دقائق و معارف پر غور کرنے میں عمر کھپا دی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اب کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ہمارے سامنے منہ کھول سکے۔

غلطی تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ

لیکن یہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ ہم جیسے کم علموں کو مجبوراً منہ کھولنا پڑا کیونکہ جماعتِ اسلامی کے اہلِ قلم اسی غلط بنیاد پر اسلام کے معاشی نظام کی عمارتیں کھڑی کرنے لگے تھے۔ مثلاً جب جماعتِ اسلامی کے ماہرِ معاشیات جناب نعیم صدیقی صاحب نے "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" نامی کتاب تصنیف فرمائی تو اس کی بنیاد بھی مضاربت کی اسی غلط تعریف پر قائم ہوئی۔ چنانچہ راقم الحروف نے آج سے کوئی پندرہ سال پہلے طالب علمانہ حیثیت سے مودودی صاحب کی مضاربت کی غلط تعریف کی ان کے سامنے نشاندہی کی۔ آپ کے لئے فقہاء کی تعریف کا انکار تو ممکن ہی نہ تھا لیکن جھوٹے علمی پندار کی وجہ سے واضح الفاظ میں اپنی غلطی تسلیم بھی نہ کی حالانکہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نے ان پر ان کی کوئی غلطی واضح کر دی تو انہیں اس کے تسلیم کرنے میں بڑی خوشی ہوگی۔ چنانچہ چار پانچ سال تک ہم اسی انتظار میں رہے کہ مودودی صاحب اپنی اس غلطی کی تحریری اصلاح کر دیں گے تاکہ اس پر اسلامی معاشیات کی جو غلط عمارتیں اٹھائی جارہی ہیں ان کا سدِباب ہو جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علمی پندار نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ ہم بھی ایکدفعہ زبان کھول چکے تھے اس لئے جب بھی موقعہ ملا مختلف مقالات میں ان کی توجہ اس طرف دلاتے رہے۔

غلط تعریف کی اصلاح

آخرکار انہوں نے اسے تسلیم تو کر لیا، لیکن بڑی استادی سے۔ ان کی جس کتاب یعنی مسئلہ ملکیت زمین سے ہم نے اوپر مضاربت کی تعریف نقل کی ہے، کا حال ہی میں کوئی ستّرہ سال بعد نیا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں اگرچہ بیسیوں مقامات پر نہایت اہم ردّوبدل کئے گئے ہیں، لیکن دیباچہ میں ان کی کوئی تصریح نہیں کی۔ بلکہ اس تیسرے ایڈیشن کا سرے سے کوئی دیباچہ ہی نہیں لکھا گیا۔ بلکہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی

گئی ہے کہ یہ پچھلے ایڈیشن کا محض " REPRINT " ہے۔ اس ایڈیشن میں مضاربت کی تعریف بدلنے میں جو ہاتھ کی صفائی دکھائی گئی ہے اس کی جھلک دیکھئے۔ اس کے لئے آپ ان کی اس عبارت کو سامنے رکھ لیجئے جسے پہلے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کو ہاتھ کی اس صفائی کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اسلامی قانون نے تجارت، صنعت اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع و نقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ (۱) معاملہ کرے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ تو اس سے کاروبار کر، نفع (۲) ہو تو اس میں آدھے یا چوتھائی کا میں حقدار ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا سرمایہ کسی عمارت کی شکل میں، کسی مشین یا انجن کی شکل میں، کسی موٹر یا کشتی یا جہاز کی شکل میں بھی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اس پر کام کر جو نفع (۳) ہو اس میں میرا اتنا حصّہ ہے۔"

(مسئلہ ملکیت زمین۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحہ ۷۹، ۸۰)

چنانچہ اس نئے ایڈیشن کے اس اقتباس میں تین جگہ ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ نمبر ایک پر مضاربت کا لفظ نکال دیا گیا ہے اور نمبر ۲ اور ۳ سے نقصان کا لفظ کاٹ دیا ہے۔ اور اس طرح ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے مضاربت کی تعریف کو درست کر لیا گیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے اس اصطلاح کا دیباچے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لئے ابھی تک بیچارے ماہرینِ معاشیات ان کی پہلی غلط تعریف کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیلات ہم نے اس لئے بیان کی ہیں کہ وہ حضرات جو اپنے آپ کو چوٹی کے ماہرِ معاشیات تصور کرتے ہیں، اسلامی تعلیمات کے بارے میں سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنے کی بجائے براہِ راست مطالعہ کی کوشش فرمایا کریں۔

سود کی دوسری اقسام

فاضل مصنف نے کتاب کو "اسلام اور سود" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن بحث کو انہوں نے زیادہ تر بنک کے سود تک محدود رکھا ہے۔ اور چونکہ یہ بحث انہوں نے سرمایہ داری کی جانبداری میں کھڑے ہو کر کی ہے اس لئے سود کی دوسری اقسام کو جائز قرار دیتے چلے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ دوسری اقسام بنک کے سود سے بھی زیادہ خطرناک ہیں اور انہوں نے مسلم معاشرہ پر اس سے بھی زیادہ بُرے اثرات ڈالے ہیں۔

زمین کی بٹائی یا لگان

انہی اقسام میں سے ایک قسم زمین کی بٹائی ہے۔ اور فاضل مصنف جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے کروڑوں انسانوں کو اس سے واسطہ پڑتا ہے جن کا تناسب بنکاری سود سے واسطہ پڑنے والوں سے سینکڑوں گنا زیادہ ہے۔ سود کی اس قسم کو آپ ان الفاظ میں جائز فرماتے ہیں:۔

"یہ امر قابلِ غور ہے کہ زمین اور بعض دوسری دیرپا اشیاء کے استعمال کے معاوضہ کی اجازت ہے۔ معاشی اصطلاح میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ عیسائیت میں سود تو ممنوع ہے لیکن لگان (یعنی زمین کی بٹائی) اور منافع جائز ہے۔ اسلام کا زاویہ نگاہ بھی یہی ہے۔" (صفحہ ۵۴)

"اسلام نے جائز غیر مکتسب آمدنی کو بھی منع نہیں کیا۔ اس نے لگان کو جائز قرار دیا ہے۔ شراکت جس میں ایک حصہ دار صرف اصل لگاتا ہے لیکن کاروبار میں کوئی عملی حصہ نہیں لیتا، اسے بھی جائز قرار دیتا ہے۔ مکانات کے کرایوں کو جائز قرار دیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس روپیہ سے اگر زمین خریدلی جائے تو وہ زمین سے لگان (یعنی بٹائی) وصول کر سکتا ہے اور یہ آمدنی جائز ہوگی۔" (صفحہ ۱۶۵)

پھر صفحہ ۲۶۳ پر یہی کہانی سوال کی صورت میں دہراتے ہیں کہ جب اسلام نے منافعوں، زمین کے لگان اور شراکتی کاروبار کے

منافعوں کو جائز قرار دیا ہے؟ .....

اشتراکی کاروبار یعنی مضاربت کی شرعی حیثیت ہم واضح کر چکے ہیں۔ اب ملاحظہ ہو کہ زمین کے لگان یا بٹائی کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے۔

مسئلۂ ملکیتِ زمین

اسلامی قانون میں زمین کو عام طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک عشری اور دوسری خراجی۔ عشری سے مراد عام طور پر عرب کی زمینیں مراد لی جاتی ہیں اور خراجی سے مراد تمام دوسری مفتوحہ زمینیں۔ اس تقسیم کے مطابق برصغیر پاک و ہند کی زمینیں خراجی قرار دی گئیں۔ تفصیلات کے لئے راقم کا اسی عنوان پر مقالہ طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۱ء میں ملاحظہ ہو۔ خراجی زمین ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین بیت المال کی ملکیت ہے اور وہ کسی فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اور معاملہ صرف حکومت اور کاشتکار کے درمیان ہوتا ہے۔ تاہم یہ زمینیں کاشتکار خاندانوں میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتیں اور اسلامی حکومت کے زوال یعنی عثمانی خلافت کے خاتمے تک اس پر عمل ہوتا رہا۔
اگر اس جگہ مشہور حنفی فقیہ علامہ شامی کی ایک عبارت نقل کر دی جائے تو مسئلہ کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

قال فی رد المختار ثم اعلم ان اراضی بیت المال المسماۃ باراضی المملکۃ و اراضی الحوز اذا کانت فی ایدی زراعھا لا تنزع من ایدیھم ما داموا یؤدون ما علیھا و لا تورث عنھم اذا ماتوا۔ ولا یصح بیعھم لھا۔ ولکن جری الرسم فی الدولۃ العثمانیہ ان من مات عن ابن انتقلت لابنہ مجاناً والا فلبیت المال ولو لہ بنت۔ (شامی لابن عابدین جلد ۳ صفحہ ۲۵۵)

(ترجمہ) رد المختار میں ہے کہ بیت المال کی اراضی جنہیں اراضی سرکاری بھی کہا جاتا ہے جب وہ کاشتکاروں کے قبضہ میں ہونگی تو وہ جب تک اس کا خراج ادا کرتے رہیں۔ ان سے چھینی نہیں جا سکتی۔ ان کی وفات پر وہ زمین وراثت میں تقسیم نہ ہوگی اور نہ ہی اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ خلافتِ عثمانیہ میں یہ رواج عمل پذیر تھا کہ جس کاشتکار کی نرینہ اولاد ہوتی تو وہ زمین اسے بلا قیمت منتقل ہو جاتی۔ لیکن صرف بیٹی ہونے کی صورت میں دوبارہ بیت المال کو واپس ہو جاتی۔

یہ تو ہے خراجی زمینوں کی شرعی حیثیت جس کے تحت برصغیر ہند و پاک کی زمینیں آتی ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی زوال تک انہیں بیت المال کی ملکیت سمجھا جاتا رہا۔ علماء کی تصریح کے مطابق مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے بعد اب یہ زمینیں پھر پہلی حالت پر لوٹ آتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو اسلام کا نظامِ اراضی از مفتی محمد شفیع صاحب مطبوعہ کراچی۔ صفحہ ۹۴) چنانچہ ان زمینوں میں تو غیر کاشتکار مالک کے لگان یا بٹائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لگان کا اگر کوئی سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ عرب کی اراضی پر جنہیں اصطلاح میں عشری کہا جاتا ہے۔

لگان یا بٹائی سود ہے

دورِ رسالت میں زیادہ تر اراضی اہلِ مدینہ کے پاس تھی جو اسے بٹائی پر کاشتکاروں کو دیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے سود قرار دے کر منع فرما دیا۔ اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک دو ارشاداتِ نبوی ملاحظہ ہوں:۔

عن ابن ابی نعیم حدثنی رافع بن خدیج انہ زرع ارضاً فمر بہ النبی صلی اللہ

علیہ وسلم وھو یسقیھا فسالہ لمن الزرع ولمن الارض فقال زرعی ببذری وعملی لی الشطر ولبنی فلان الشطر۔ فقال اربیتما - فرد الارض علی اھلھا وخذ نفقتک۔

(سنن ابوداؤد - مطبوعہ مصر جلد ۳ - صفحہ ۳۵۵)

(ترجمہ) ابن ابی نعیم سے روایت ہے کہ مجھ سے رافع بن خدیج نے بیان کیا کہ اس نے ایک زمین کاشت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گذر ہوا۔ اور وہ کھیتوں کو پانی دے رہا تھا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین اور کھیتی کس کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بیج اور کام کی شرط پر یہ کھیتی میری ہے۔ اس میں ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک فلاں کا۔ تو آپ نے فرمایا کہ آپ دونوں نے سود کا معاملہ کیا۔ زمین مالکوں کو واپس کر دو اور ان سے اپنے اخراجات لے لو۔

ایک دوسری حدیث میں زمین کے اس لگان کو آپ نے نہ صرف سود قرار دیا بلکہ اس پر سخت وعید بھی سنائی۔

عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیاذن بحرب من اللہ ورسولہ - (ایضاً)

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص بٹائی چھوڑنے پر تیار نہیں، وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔

اس حقیقت کو غور سے ملاحظہ فرما لیا جائے کہ زمین کا لگان یا بٹائی کو سود قرار دینے والے یہ کوئی آج کے جدت پسند اہلِ علم نہیں بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ معلوم نہیں فاضل مصنف جنہوں نے بنک کے سود کے خلاف عقلی دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں، اس معمولی سی بات کو کیوں نہ سمجھ سکے کہ عقلی طور پر بھی بنک کا سود اور زمین کی بٹائی دونوں سو فیصد ایک ہی چیز ہیں یعنی دس ہزار روپیہ اگر بنک میں جمع کرا کے اس کا معمولی شرح پر سود لیا جائے تو وہ حرام لیکن اگر اسی رقم کی اراضی خرید کر اس سے دوگنا بلکہ چارگنا منافع (لگان) حاصل کر لیا جائے تو جائز۔ اس کے برعکس مغربی ماہرین معاشیات جن کی راہنمائی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشادات موجود نہیں تھے وہ زمین کے لگان اور بنک کے سود کو ایک ہی چیز سمجھتے رہے ہیں۔ مثلاً فاضل مصنف نے جگہ جگہ ایک جدید ماہر معاشیات لارڈ کینز (KEYNES) کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ جیسا کہ زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۹۸ کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سود سے مراد "وہ اعلیٰ معاوضہ جو قدیم زمانے میں اراضی پر اور عہد حاضر میں سرمایہ پر وصول کیا جاتا ہے" لیتے ہیں۔

صریح اور غیر صریح سود

کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر سود کے بارے میں فاضل مصنف نے حضرت عمرؓ کے چند اقوال نقل کئے ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے:-

عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ ان اٰخر ما نزلت اٰیۃ الرّبوٰا وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربوٰا والریبۃ۔

(ترجمہ) حضرت عمرؓ بن خطاب سے روایت ہے کہ آیت ربوٰ سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے سامنے آیت ربوٰ کی تفصیل نہ بیان کی تو سود اور جس میں سود کا شبہ ہو سب کو چھوڑ دو۔

اب یہ لگان یا بٹائی کا معاملہ تو ایسا ہے کہ حضور صلعم نے خود اسے اپنی زبان مبارک سے سود قرار دیا۔ اور پھر سود کی جو عقلی تعریف کی

جاتی ہے اس پر پورا اترتا ہے۔ فاضل مصنف کو احتیاط کا پہلو سامنے رکھتے ہوئے غیر صریح سود کے جواز سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے تھا۔ چہ جائیکہ وہ بالکل صریح سود اور وہ بھی ملت کے لئے سب سے خطرناک قسم کو جائز قرار دے رہے ہیں۔

مکانوں کا کرایہ

سود کی ایک اور قسم مکانوں کا کرایہ ہے۔ اسے سود شمار نہ کرنے کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے اکثر غریب اور متوسط آمدنی کے لوگ اپنی سر چھپانے کی جگہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شرعی اور تاریخی لحاظ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی قسم کی زمین چاہے وہ زرعی ہو یا رہائشی، بیچنے کی اجازت نہیں تھی۔ آج تو سرمایہ دار رہائشی قطعات صرف اس لئے خرید کر رکھ چھوڑتے ہیں کہ چند سال بعد ان کی قیمت میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ غیر محدود منافع کما سکیں گے۔ لیکن اسلامی مملکت میں اس کی اجازت نہ ہوگی۔ بلکہ لوگ تو اپنے رہائشی مکانات کی زمین کے بھی مالک نہ ہوں گے بصرف اس پر بنی ہوئی عمارت پر حقِ ملکیت جتا سکیں گے۔ اس لئے ان احکامات کی روشنی میں تو کرائے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔

مکانات کے کرائے کا سوال عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں پیدا ہوتا ہے۔ آج بھی ہمارے ہاں دیہات میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ دورِ رسالت میں مکہ معظمہ بین الاقوامی حیثیت کا حامل تھا۔ اور یہ اعلیٰ مقام اسے ابھی تک حاصل ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے گراں کرائے وصول کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے اس معاملہ کو سود قرار دے کر کرائے کے لینے سے ان الفاظ میں منع فرما دیا تھا۔

من اکل کراء ارض مکة فکانما اکل الربوٰ۔ (ہدایہ مطبوعہ دہلی جلد ۴ صفحہ ۴۵۷)

(ترجمہ) جس نے مکہ معظمہ کے مکانوں کا کرایہ کھایا اس نے گویا سود کھایا۔

اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی زمین کی خرید و فروخت کی کامل نہی فرما دی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص جلد ۳ صفحہ ۲۸۲)

لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان ارشاداتِ نبوی کے باوجود آج بھی دنیا کے سب سے گراں کرائے مکہ معظمہ کے مکانوں کے وصول کئے جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ یہ احکامات صرف مکہ معظمہ ہی کے لئے خاص نہیں تھے بلکہ بعد میں مسلمانوں نے جو بھی بڑے یا بین الاقوامی شہر بسائے ان میں انہی احکامات پر عمل کیا گیا۔ مثلاً جب بغداد کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی تو علماء نے سب سے پہلے اسی شرعی حیثیت کو اجاگر کیا کہ اس شہر کی زمین بھی نہیں بیچی جا سکتی۔ لوگ اپنے مکانوں کے ملبے کے مالک ہوں گے نہ کہ زمین کے قطعے کے۔ خطیب بغدادی نے یہ اصولی بحث اپنی مشہور کتاب تاریخ بغداد کی پہلی جلد کے پورے چالیس صفحات میں سمیٹی ہے۔

سود کی سب اقسام ترک کرنی ہونگی

ہم فاضل مصنف کی بغیر سود کے بنکاری کی اسکیم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ سود کی تمام اقسام بشمول زمین کی بٹائی یا مکان مکانوں کے کرائے وغیرہ کو ختم نہیں کریں گے یہ بنک اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب مضاربت کے اصول پر بنک میں روپیہ رکھنے پر خسارے کا امکان ہو تو صاحبِ سرمایہ کیوں نہ اس رقم سے زرعی اراضی یا مکان خریدے گا جس میں خسارے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ بلکہ منافع بھی بنک کی نسبت دوگنا، چوگنا ملے گا۔

آخری گزارش

ہم ایک آخری گزارش کے ساتھ اس تبصرے کو ختم کرتے ہیں۔ کتاب میں زیادہ تر بنک کے سود سے بحث کی گئی ہے۔ اس لئے اگر اس کا نام "اسلام اور بنک کا سود" ہوتا تو زیادہ مناسب رہتا۔ دوسرے اس کتاب سے زیادہ تر معاشیات کے طالب علم ہی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اور ان کی جیبوں کو دیکھتے ہوئے ۲۱۰ صفحات کی چھوٹی تقطیع

کی اس کتاب کی قیمت دس روپے قدرے زیادہ ہے۔

سود شریعتِ اسلامی میں سب سے سنگین جرم شمار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع کی اس اہم کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے تمام گوشوں کو واضح کر دیا جائے اور ہم فاضل مصنف سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ہماری گزارشات کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

(۰)

طلوعِ اسلام

تفصیل معنی غم الفت طویل ہے۔ اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے۔ سود پر لکھنے کو کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں (اور لکھی گئی ہیں)، لیکن قرآن کریم کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل چار لفظوں میں ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ جو منافع محض سرمایہ پر حاصل کیا جائے خواہ اس کی کوئی شکل کیوں نہ ہو) وہ ربا ہے جسے قرآن کریم اسلامی نظام کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیتا ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ قرآن کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے لہذا، مملکت اسلامی کے خلاف بغاوت کے مرادف۔ مضاربت، مزارعت، مکانوں کے کرائے، کمرشل انٹرسٹ، بینکوں کا سود، وغیرہ تفریقات، ایک حرام قطعی کو حلال قرار دینے کی تاسف انگیز کوششیں ہیں جو یا تو فریبِ نفس پر مبنی ہے اور یا دین فروشی پر۔ و ذالک الدین القیم۔

(—)

اعلان

ماہ نامہ طلوع اسلام ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی خریدار کو پرچہ وقت پر نہ ملے تو اس کی اطلاع ادارہ میں ۵ ارتاریخ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے تاکہ تعمیل کی جا سکے۔

اطلاع پندرہ تاریخ کے بعد موصول ہونے کی صورت میں پرچہ **قیمتاً ارسال ہو گا۔**

خط و کتابت میں سالانہ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

ناظم

رشتہ مطلوب ہے

ایک معزز اور متوسط گھرانے کے سلیم الطبع ایم۔ اے پاس، قرآنی فکر کے حامل عمر ۳۲ سال، برسرِ روزگار نوجوان کے لئے کم از کم بی۔ اے پاس سلیقہ شعار امور خانہ داری سے واقف قرآنی فکر کی حامل بعمر تا ۲۸-۲۹ سال دوشیزہ کا رشتہ مطلوب ہے۔ پہلے ہی خط میں مکمل تفصیلات ارسال فرمائیں۔

ا۔ ع۔ ش۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا یہ واقعی شہید ہیں؟

۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کی صبح، بزم طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں 'شہدائے پاکستان' کی یاد میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس سے پرویز صاحب نے عنوان بالا پر خطاب فرمایا۔ خطاب برجستہ تھا جسے بعد ازاں مقالہ کی شکل میں مرتب کیا گیا

صدر محترم، برادران گرامی قدر، اور میری عزیز بیٹیو اور بہنو! سلام و رحمت

آج ہم جس عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قانونی طور پر مملکت پاکستان کا وجود ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو عمل میں آگیا تھا، لیکن اُسی دن سے ہندو اور انگریز نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اس مملکت کو باقی نہیں رہنے دیں گے، اور جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا، انہوں نے اپنے اس مذموم ارادے کو چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے تشکیل پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی اس کا بھی بلند آہنگی سے اظہار کر دیا اور ساری دنیا کو پکار کر سنا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سترہ اٹھارہ برس تک اس سازش کو پختہ کرتے رہے، اور چھوٹی چھوٹی آزمائشی جھڑپوں کے بعد انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بلا اطلاع، شب خون مارنے والوں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا۔ رات کی چادر میں لپیٹ کر یورش کرنے والے ڈاکوؤں کی طرح پاکستان پر ٹوٹ پڑے، ہمارے قابلِ صد فخر جیوش قاہرہ نے جس عدیم النظیر پامردی سے ان کا مقابلہ کیا، اور جس فقید المثال جرأت و بسالت سے انہیں پسپا کیا، اس کے تصور سے ساری دنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ اور باور ہی نہیں کرتی کہ ایسا بھی ممکن تھا۔ پاکستان کی بنیاد درحقیقت جنگِ ستمبر کے اُن سترہ دنوں میں رکھی گئی اور اس مملکت کا یہی

پاکستان کا یوم تاسیس

یوم تاسیس ہے جس کی یادگار منانے کی سعادت ہم آج حاصل کر رہے ہیں۔ اس جنگ میں جان دینے والے سرفروشوں کو ہم شہید کہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے —اور یہ سوال عام طور پر ہماری نئی نسل کے نوجوانوں کی طرف سے ہوتا ہے— کہ کیا ہم ان جانثاروں کو محض رسماً شہید کہہ دیتے ہیں یا وہ فی الحقیقت ایسے تھے (اور ایسے ہیں)؟ چونکہ یہ سوال کچھ زیادہ عام ہوتا جا رہا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے آج کے خطاب کا خصوصی موضوع یہی رکھا ہے۔ میں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا

شہید کا لفظ

چاہتا ہوں کہ جنگ میں اس طرح جان دینے والوں کے لئے قرآن مجید میں شہید کا لفظ نہیں آیا۔ اس میں انہیں مقتولین فی سبیل اللہ — اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے — ہی کہا گیا ہے لیکن

چونکہ مومن، جان دے کر اپنے دعوائے ایمان کی صداقت کی عملی گواہی پیش کرتا ہے، اس لئے اسے عرف عام میں شہید کہا جاتا ہے۔ شہید کے معنی گواہ یا نگران کے ہوتے ہیں اور شہادت گواہی کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ سوال بالعموم ہماری نئی پود کے نوجوانوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جنگ دو ملکوں، دو قوموں یا دو مملکتوں کے درمیان تھی۔ ہمارے جیالے جوانوں نے اپنی جان دے کر اس مملکت کو بچا لیا۔ ان کا یہ کارنامہ بیشک درخور صد تحسین و آفرین ہے لیکن ایسا تو ہر ملک کی محب وطن فوج کرتی ہے۔ پھر وہ فرق کیا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے ہاں کے ان جاں سپاروں کو شہید کہتے ہیں، اور دوسری قوموں کے اسی قسم کے جانفروشوں کو ایسا نہیں کہتے۔

ان نوجوانوں کے دل میں اگر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ نہیں، ہم ہیں، جنہوں نے انہیں تاثر ہی ایسا دیا ہے۔ آپ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے سترہ دنوں پر، اور اس کے بعد اس چھ سال کے عرصہ پر غور فرمائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اس جنگ کو محض وطن کی جنگ کہہ کر پکارا ہے۔ آپ ان ترانوں کو سامنے لائیے، جو ان جیالوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے گائے گئے، یا ان قصیدوں کو دیکھئے جو ان کے اعزاز میں پڑھے یا لکھے گئے۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ ان جانفروشوں سے کہا گیا تو یہ کہ:

اے جانِ وطن، سلطانِ وطن — دم سے تیرے قائم شانِ وطن

یا — وطن کے تم ہو پاسباں — تمہاری ہمتیں جواں

یا یہ کہ — تم جنت کے باغ کی رنگیں بہار ہو — تم قوم کا غرور، وطن کا وقار ہو

انہیں پیغام دیا گیا تو یہ کہ: تم اپنے وطن کی حفاظت کو جاؤ — وطن کو بچاؤ

اس کے جواب میں ان کی زبان سے کہلوایا گیا کہ:

ہم ہیں وطن کے نوجواں — ہم ہیں وطن کے پاسباں
ہم ہیں وطن کی آبرو — ہم ہیں وطن کی عز و شاں

ان کے لئے دعائیں مانگی گئیں تو اس قسم کے الفاظ میں کہ:

اے میرے وطن کے پاسبان — زندہ باد

اور وہ کونسا کان ہے جس میں اس ترانے کی صدائے بازگشت نہیں گونجی کہ:

اے وطن کے سجیلے جوانو! — میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

اور اس کورس کی ولولہ انگیز آواز کہ

وطن ہے ہمارا، وطن کے ہیں ہم — یہی دھن ہے جب تک ہے دم میں دم

یا — اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن — کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن

اور آخر میں پورے زور سے یہ دھمال کہ: اے مادرِ وطن، اونچا ہو تیرا نام

آپ دیکھیں گے کہ ان میں وطن سے آگے کچھ اور کہا ہی نہیں گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وطن کی حفاظت کے لئے جنگ ہر قوم کرتی ہے۔ چنانچہ جنگ کے دوران جہاں ہمارے ریڈیو سے وطن کے ان سرفروشوں کے حق میں ترانے گائے جاتے تھے، بعینہٖ انہی الفاظ میں، آکاش وانی، (انڈیا) ریڈیو سے ہندوستانی سپاہیوں کے حق میں قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب یہاں میجر عزیز بھٹی کو شہید وطن کہہ کر، ملک کے بلند ترین اعزاز سے نوازا گیا تو انہوں نے بھی اپنے ہاں کے ایک (فرضی یا حقیقی) فوجی عبدالحمید نائیک

کو انہی الفاظ سے پکارا۔ ان دیں حالات، اگر ہمارے نوجوان طبقہ کے دل میں اس قسم کے سوالات ابھریں کہ اگر وطن کی حفاظت میں جان دے دینا شہادت ہے تو اسے پاکستان تک کیوں محدود رکھا جاتا ہے، دنیا کی ہر قوم کے سپاہی جو اپنے اپنے وطن کی حفاظت میں جان دیدیں، اسی اعزاز کے مستحق قرار پانے چاہئیں، تو وہ ایسا پوچھنے میں حق بجانب ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر پاکستان بھی دنیا کی دیگر مملکتوں جیسی ایک مملکت ہوتی تو اس کی حفاظت کے لئے لڑنے اور جان دینے والوں اور دیگر مملکتوں کے اسی قسم کے سرفروشوں میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ یہ بھی انہی کی طرح "محبِ وطن" جانباز کہلاتے۔ اور بس۔ لیکن

مملکتِ پاکستان کی انفرادیت

مملکتِ پاکستان، دنیا کی دیگر مملکتوں میں سے ایک مملکت نہیں۔ اس کی حیثیت یکسر منفرد (UNIQUE) ہے۔ اور اس کی یہی انفرادیت ہے جو کارزارِ مملکت کے ہر گوشے میں اسے دوسری مملکتوں سے متمیز کر دیتی ہے۔ ہماری انتہائی بدقسمتی، اور ہماری نئی نسل کی حرماں نصیبی ہے کہ ہم نے اپنے غلط نظامِ تعلیم کی وجہ سے، انہیں بتایا ہی نہیں کہ یہ مملکت، دنیا کی دیگر مملکتوں سے کس اعتبار سے منفرد ہے اور اس کی وہ امتیازی خصوصیت کیا ہے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ہے ہماری وہ مجرمانہ فروگذاشت جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل کے دل میں اس قسم کے سوالات ابھرتے ہیں اور جن کا اطمینان بخش جواب نہ ملنے کی وجہ سے، وہ عجیب قسم کی پریشانئ فکر و نظر کا شکار، اور اضطراب انگیز ذہنی اور قلبی کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اس فرق کو سمجھنے کے لئے درحقیقت، اسلام اور دیگر مذاہب کے بنیادی فرق کا سمجھنا ضروری ہے۔ مذہب، خدا اور بندے

دین اور مذہب کا فرق

کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا اظہار پوجا پاٹ یا دیگر رسوم و شعائر کی شکل میں ہوتا ہے۔ ایسے امور مملکت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ مملکت اپنا کاروبار سیکولر انداز سے سرانجام دیتی رہتی ہے اور مذہب پرستوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے طریق پر الیشور کی پوجا پاٹ یا خدا کی بندگی اور پرستش کرتے رہیں۔ لیکن اسلام، مذہب نہیں۔ دین ہے، اور دین کے معنی ہوتے ہیں وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق امورِ دنیا سرانجام دیئے جائیں۔ یہ وجہ ہے کہ مذہب تو ہر مملکت میں، اور ہر قسم کی حکومت کے تحت زندہ رہ سکتا ہے، لیکن اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اس صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ احکامِ خداوندی کو قانونی حیثیت سے نافذ کر سکے۔ اسی لئے قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ، خدا کے عطا کردہ اصولِ حیات اور نظریاتِ زندگی کی صداقت کو تسلیم کر کے، اس کے متعین فرمودہ پروگرام کے مطابق کام کریں گے، انہیں مملکت مل جائیگی جس کا مقصد یہ ہوگا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴/۵۵) کہ وہ اس میں اپنے دین کو متمکن (ESTABLISH) کر سکیں۔ لہٰذا اسلامی مملکت، دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح ایک مملکت نہیں ہوتی۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے دین کو متمکن کرنے کا۔ اور یہی اس کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا کی دیگر مملکتوں سے منفرد اور متمیز ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کی تصریحات

ہمارے صدرِ اول کے بعد، یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں اسے سب سے پہلے، علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء میں (الٰہ آباد کے مقام پر) قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا تھا۔

ہندوستان، دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے . . . . حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے

درمیان ایک روحانی واسطے کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے...... (اور یہ حکومت) صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر لی جائے۔

اپنے اس بنیادی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اپنے "خطباتِ تشکیلِ جدید" میں کہا تھا:

اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے، اسلام کے مثالی نصب العین کو زمان اور مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ ان بلند تصورات کو انسانی ہئیتِ اجتماعیہ میں متشکل کرنے کی آرزو کا نام ہے (ص ۱۴۲)

اسلام تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ صرف خدا سے عہد استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (ص ۱۴۷)

یہ تھی مطالبۂ پاکستان کی پہلی اینٹ۔ اسی حقیقت کو قائد اعظم نے، ۱۹ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد (دکن) میں، واضح تر الفاظ میں بیان کیا تھا۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ایک وفد نے ان سے سوال کیا کہ آپ جس مملکت کے حصول کے لئے کوشش کر رہے ہیں، اس کی امتیازی خصوصیت کیا ہوگی، اور وہ کن معنوں میں دنیا کی دیگر مملکتوں سے ممیز و منفرد ہوگی۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ مذہب اور مذہبی حکومت (RELIGION & RELIGIOUS STATE) کے لوازم کیا ہیں۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا کہ:

قائداعظم کی تشریح

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGIOY) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن، خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ نہ میں کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔"

اس کے بعد انہوں نے کہا:

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

یہ تھا تو ضیحاتِ من، مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جذبۂ محرکہ نہ (عام معانی میں) سیاسی تھا نہ معاشی۔ نہ اس تقاضا کی بنیاد اس پر تھی کہ ہندو نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا تھا اس لئے ہم علیحدگی چاہتے تھے۔ یہ ہمارا دینی تقاضا تھا۔ یہ اسلام کا مطالبہ تھا اسلام کو صحیح معنوں میں اسلام بننے کے لئے الگ، آزاد مملکت کی ضرورت تھی۔ یہی نظریۂ پاکستان تھا۔ یہی اسلامک آئیڈیالوجی ہے اور یہی وہ نظریہ یا آئیڈیالوجی ہے جس کی ہندو اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت کرتا تھا۔ اس کی مخالفت کی بنیاد یہی نہیں تھی کہ اس طرح

ہندو کیطرف سے مخالفت

ہندوستان کا ایک ٹکڑا الگ ہو جائے گا۔ اُس کی مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت بن جائے۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اسلامی اصول مملکت کے آئین اور قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل ہوں۔ اور اس کی اس مخالفت کی وجہ قابلِ فہم تھی۔ ایک طرف وہ جانتا تھا کہ ہندو نظام معاشرہ کس قدر انسانیت سوز اور آدمیت کش تھا جس معاشرہ کی بنیاد جنم کے اعتبار سے طبقاتی تقسیم، اور جس مذہب کی اساس لکشمی دیوی (دولت کے معبود) کی پرستش پر ہو، جس نظام میں سب سے بڑے سرمایہ دار کو مہاجن (سب سے بڑا انسان) قرار دیا جائے، اس معاشرہ کے دیو ذلیل انسانیت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے متعلق اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھا، اور دوسری طرف اس کی نگاہ تاریخ پر تھی جس میں وہ دیکھ رہا تھا کہ جب اسلام کو بحیثیت ایک نظام مملکت فروغ حاصل ہوا تھا تو اس نے دنیا کے ہر انسانیت سوز نظام کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کا نظام اس کے آغوش میں پرورش پا کر پروان چڑھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اس کی موت مضمر ہے — وہ جانتا تھا کہ اسلام کے عملی نظام کے معنی ہیں:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

وہ جانتا تھا کہ اس قسم کا انقلابی پروگرام اگر اس کی سرحد کے پار عملاً وجود میں آگیا تو ہندوستان، بلا منت شمشیر، اسلام کے آغوش میں چلا جائیگا۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا، اور اس کی پوری پوری کوشش تھی کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

ہٰذہٖ — ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

یہ تھی ہندو کیطرف سے تشکیلِ مملکت پاکستانیہ کی مخالفت کی اصلی لِم — وہی چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری جو ازل سے تا امروز برابر چلی آ رہی ہے۔

عزیزانِ من! یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی نظام کا تصادم قرآنی نظام سے ہوگا، وہ نظام پاش پاش ہو جائیگا۔ خدا نے جو کہا تھا کہ الدّین یعنی اسلامی نظام لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ؕ دنیا کے ہر نظام پر غالب آجائے گا، تو وہ اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ ہندو اسے

قرآنی نظام کا غالب آنا

اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے زندہ رہے۔ اسکے لئے وہ ہر طرح کی آزادی اور ضمانت دینے کے لئے تیار تھا، لیکن وہ اسے بحیثیت ایک نظام کے ایک آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ محض ظن و قیاس نہیں۔ اس کی تائید میں تاریخی شہادات موجود ہیں۔ پاکستان کا ریزولیوشن مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا، تو مہاتما گاندھی تڑپ اٹھے، اور انہوں نے اپریل ۱۹۴۰ء کے شروع میں کہا کہ

گاندھی کا اضطراب

"میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے بعض خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کیطرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں

اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ باقی سے متنبہ نہ کردوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔" (ہندوستان ٹائمز۔ بحوالہ ۷)

ان کا یہ بیان 'ہندوستان ٹائمز' میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہی اخبار اپنے ایک اداریہ میں لکھ چکا تھا کہ

"حکومتِ خداوندی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔"

(ہندوستان ٹائمز۔ بحوالہ ۱۱)

(مہاتما) گاندھی نے اپنا مذکورہ بالا بیان، ۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو شائع کیا تھا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد انہوں نے لکھا کہ:

"میری روح اس تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کرلینا میرے نزدیک خدا کے انکار کا مترادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔" (ہندوستان ٹائمز۔ بحوالہ ۱۲)

آپ کو معلوم ہے کہ "قرآن اور گیتا" کا خدا ایک ہے' کہنے سے گاندھی کا مطلب کیا تھا؟ ان کا یہ مطلب انہی کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ

"یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔"

ضمناً' یہ بات انہیں ابوالکلام آزاد نے سمجھائی تھی جنہوں نے اپنی تفسیر (سورۂ فاتحہ میں) لکھا تھا کہ:۔

"عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔"

آپ نے غور فرمایا کہ عزیزانِ من! کہ ہندو کی طرف سے مخالفت کی بنا کیا تھی؟ وہ اسلام کے اس تصور کی مخالفت کرتا تھا جس کی رُو سے وہ ایک آزاد مملکت میں زندہ نظام کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ بہرحال' ہندو کی طرف سے اس تصور کی مخالفت ہوتی رہی' اور قائداعظمؒ

مخالفت کی شدت

اپنے اس دعویٰ اور مطالبہ کو برابر دہراتے چلے گئے ـــ یعنی اس دعویٰ کو کہ اسلام اسی صورت میں اسلام کہلا سکتا ہے جب اس کی تنفیذ کے لئے مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت ہو جس شدت سے وہ اس دعویٰ کو دہراتے تھے' اسی نسبت سے ہندو کی مخالفت تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ (مہاتما) گاندھی نے اب کھلے الفاظ میں کہنا شروع کر دیا کہ،

"اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت' رسل و رسائل' امور خارجہ وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔" (ہریجن۔ بحوالہ ۹)

لیکن ایسا کہتے وقت گاندھی بھول جاتا تھا کہ اس کا مدمقابل کون ہے؟ اس کا مدمقابل محمد علی جناح جیسا دیدہ ور تھا۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اس قسم کے "اپدیش" دینے شروع کر دیئے تو قائداعظمؒ نے اسے ایک خط میں لکھا کہ

"آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے

پر آمادہ کرتا ہے ۔ کیا وہ جذبہ، وہ مقصد، مذہبی ہے، یا معاشرتی یا سیاسی ۔ تو آپ نے کہا تھا کہ خالص مذہبی ۔"

(قائد اعظم کا خط بنام گاندھی، مورخہ یکم جنوری ۱۹۴۰ء)

لیکن ادھر اکیلا گاندھی نہیں تھا۔ اس کی پوری کی پوری فوج اس کے ساتھ تھی۔ گاندھی کے بعد جواہر لعل نہرو بولے کہ:

جواہر لعل نہرو

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) کہا جاتا ہے اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مخالفت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔" (میری کہانی)

اس نے یہ کہا اور دوسری طرف سے اسی کے ہم مرتبہ ایک اور کانگرسی لیڈر، مسٹر دلبھائی ڈیسائی پکارا کہ:

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔" (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۹۴۵ء)

ہندو اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ اگر یہ مخالفت تنہا اسی کی زبان سے ہوتی رہی تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے' اس لئے اس نے خود

مسلمان ہم نوا

مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور اس مخالفت میں انہیں آگے آگے رکھا۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کون کون لوگ تھے اور انہوں نے کس کس طریق سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اس وقت میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اس مخالفت میں ہندوؤں نے خود مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کو آگے بڑھایا اور جیسا کہ کرائے کے ہم نواؤں کا شعار ہوتا ہے انہوں نے اس راگ کو اور بھی زیادہ اونچے سُروں سے الاپا۔ (مثلاً) میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر لٹکا دیا جائے ۔۔۔ اس نے یہ کہا اور دوسری طرف سے (خیر سے آپ کے شاعر انقلاب) جوش ملیح آبادی صاحب نے یہ کہہ کر مصرعہ اٹھایا کہ بجا فرمایا آپ نے۔ مذہب ہے ہی ایسی چیز۔

"عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ۔ صد معاذ اللہ) حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعے نوع انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی' اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے تھے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے نہ طلب فرمائیے عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر اندازہ کر لیجیے کہ نوع انسان کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔"

(جوش صاحب کا اپنا ماہنامہ کلیم۔ نومبر ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد اس نے کہا:

"اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافیائی صداقت اور فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے

باہر ہے۔" (کلیم۔ دسمبر ۱۹۴۷ء)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ ہندوستان میں لڑائی کس بات پر تھی؟ اور بناۓ نزاع کیا؟ مسلمان کا مطالبہ کیا تھا اور ہندوؤں کی مخالفت کس بات پر تھی۔ مطالبہ یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد اسلام پر ہو، اور ہندو یہ کہتا تھا کہ ہم اس قسم کی مملکت کسی حال میں بھی قائم نہیں ہونے دیں گے۔ یہ تھا ملخص اس ساری لڑائی کا۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

"مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔"

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

"ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو، وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کر لیں۔"

اس کے برعکس خود ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، وہ بھی دیکھتے جائیے۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ

"ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو، جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔"

(ڈاکٹر رادھا مکرجی ۔۔۔ ہندو مہاسبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر)

(-)

مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا گیا

کامل نو دس سال کی مسلسل جنگ کے بعد ہندو کو بالآخر اس مملکت کے آئینی وجود کو تسلیم کرنا پڑا اور اگست ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کو ایک الگ خطۂ زمین مل گیا تاکہ وہ اس میں اپنے مخصوص اور منفرد نظریہ کے مطابق خود مختار مملکت قائم کر لیں۔ ہندو کو یہ فیصلہ طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑا لیکن اس سے اس کے دل میں کرب و اضطراب کا جو طوفان ابھرا، اسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود چھپا نہ سکا۔ تقسیم ہند کے اس اصولی فیصلہ سے تین ارکان متعلق تھے۔ ہندو (جن کی نمائندہ کانگریس تھی) مسلمان (جن کی نمائندہ مسلم لیگ، یا بالفاظ صحیح قائداعظم تھے) اور انگریز۔ اس تقسیم کا اصولی اعلان ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا:

ہندو کا اضطراب

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔"

کانگریس کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس وثیقہ پر دستخط ثبت کر رہے

ے معلوم نہیں وہ کونسی علامت تھی جس سے یہ حضرت سابقہ قومیت بدل کر پاکستانی قومیت اختیار اور پاکستان کو اپنا وطن بنا چکے ہیں!

تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ اعلان بھی کر رہے تھے کہ :

"ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں۔ اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنے ٹیک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"

پاکستان دشمنی کے بھرے ہوئے جذبات کے اظہار میں ہندوستان کی کوئی پارٹی بھی ایک دوسرے سے پیچھے نہیں تھی۔ مذکورہ بالا اعلانات کانگریس کی طرف سے ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ہندو مہا سبھا کے صدر، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی یہ کہہ رہے تھے کہ :

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، اور خواہ اس کے لئے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے پڑیں۔　　(آرگنائزر - ۷ مئی)

اور تو اور سوشلسٹ پارٹی کے ممتاز لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، تک اعلان کر رہے تھے کہ :

"ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حد فاصل ہٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو کالعدم قرار دے دینا چاہیئے۔"　　(ان کی کتاب "اگلا قدم")

اس سمجھوتے کا تیسرا فریق انگریز تھا جس کے رویہ کے متعلق ہم نے ابھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں یہ کہہ کر بھی زہر بھرا جاتا ہے

انگریز کی طرف سے مخالفت

کہ تقسیم ہند کی اسکیم درحقیقت انگریز کے دماغ کی اختراع تھی جس سے مقصد ہندوستان کو کمزور کرنا تھا۔ مسلم لیگ اس کی اس اسکیم کو بروئے کار لانے کا آلۂ کار تھی۔ — محمد علی جناح کس طرح ساری عمر انگریز کے خلاف کھلی لڑائی لڑتے رہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ اسے میں کسی دوسری تقریب پر اٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ تحریک پاکستان کی مخالفت میں انگریز، ہندو سے کم نہیں تھا۔ اور قائداعظم جہاں ہندو کو بار بار متنبہ کرتے تھے کہ وہ اس مخالفت سے باز آ جائے۔ وہ انگریز سے بھی برملا کہتے تھے کہ ہم اس کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان متشکل کر کے رہیں گے۔ انہوں نے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں (اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں کہا تھا کہ :-

"برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو، لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔"

انہوں نے مارچ ۱۹۳۹ء میں، مرکزی اسمبلی کے بھرے اجلاس میں، پوری جرأت اور بیباکی سے کہا کہ :

"میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں مل کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو لیکن ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

حتیٰ کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں اعلان کر دیا تھا کہ :

"ہمارا کوئی دوست نہیں۔ نہ ہمیں انگریز پر بھروسہ ہے، نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے خواہ

وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔"

اور انگریز کی اسی آتشِ مخاصمت کا نتیجہ تھا کہ جب اسے مجبوراً تقسیم ہند کے معاہدہ پر دستخط کرنے پڑے تو اس زمانے کے وزیراعظم لارڈ ایٹلی نے (جو اس وقت مسٹر ایٹلی تھے) اس بل کو پارلیمان میں پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:

"ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔" (پاکستان ٹائمز - ۱۵/۱۲/۵)

اس طرح پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تھی۔

—— (۰) ——

تشکیلِ پاکستان کے بعد

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوؤں کو بھی ایک آزاد مملکت مل گئی اور مسلمانوں کو بھی۔ چونکہ ہندوؤں کے نزدیک مملکت مقصود بالذات تھی، اس لئے ان کی تگ و تاز کا سفر ختم ہو گیا لیکن مسلمانوں کے نزدیک 'مملکت' مقصود بالذات نہیں تھی بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ اسی لئے وہ اپنے سفر میں ہنوز آخری منزل تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ اپنی جدوجہد کی ایک نئی وادی میں داخل ہوتے تھے۔ یوں سمجھئے جیسے ہم ایک مسجد کی تعمیر کے لئے قطعۂ اراضی حاصل کرنے کے لئے تگ و تاز کریں۔ برسہا برس کی سعی و کاوش کے بعد وہ قطعہ ہمیں حاصل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس قطعۂ اراضی کا حصول ہماری جدوجہد کی آخری منزل نہیں ہو گا۔ اس کے بعد تعمیرِ مسجد کا مرحلہ ہمارے سامنے آئیگا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت 'قائداعظمؒ نے' تشکیلِ پاکستان کے' دو ہی ماہ بعد (اکتوبر ۱۹۴۷ء میں) خالق دینا ہال کراچی میں 'عمالِ حکومت سے اپنے اولین خطاب میں ان الفاظ میں کی:

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں' اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لا سکیں۔"

یہاں سے دین اور مذہب کا فرق پھر نمایاں طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہم ہندوستان میں تھے تو ہمیں پوری

دین اور مذہب کا عملی فرق

پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس آزادی کا اعلان تو ملکہ وکٹوریہ نے اپنے منشور میں کر دیا تھا۔ ہندو بھی اس کا وعدہ کرتا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد مسلمانوں کو بدستور مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ نیشنلسٹ علماء جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ہندو کے ہمنوا تھے اپنے مسلک کے جواز میں دلیل ہی یہ پیش کرتے تھے کہ جب مسلمانوں کو 'ہندوستان میں رہتے ہوئے' مذہبی آزادی حاصل رہیگی تو پھر ایک الگ مملکت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ان کی یہی وہ دلیل تھی جسے رد کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تصور کہ اسلام نماز، روزے، حج، زکوٰۃ 'یا شخصی قوانین کا نام ہے اسے امورِ دنیا سے کوئی واسطہ نہیں' ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ تھا۔ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا تو اس کے لئے بنیادی دلیل یہ دی تھی کہ اس طرح، اس اسلام کی جگہ جو ہمارے دورِ شہنشاہیت کا وضع کردہ ہے، ہم حقیقی اسلام کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان کے الفاظ یہ تھے کہ :

" اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آجائے گا جس سے یہ اس غلبہ کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا دیا تھا۔ اور یہ اس قابل ہو سکیگا کہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔ "

جیسا کہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں، ہندو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی آزادی حاصل رہے۔ لیکن وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام، ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے پھر سے زندہ ہو جائے۔ اس میں اسے اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔ اور یہی وجہ اس کی انتہائی مخالفت کی تھی۔ اس درجہ تک مخالفت کی کہ رہا تما گاندھی نے پاکستان بننے سے تین دن پہلے کہا تھا کہ

" اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے تو پھر بھی ہم مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی طلب کیوں نہ کریں۔ " (دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لومبی)

حصول و تشکیلِ پاکستان کے اس پس منظر کے بعد میں اپنی قوم کی ترزاؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ بات اب بھی ان کی سمجھ میں آتی ہے یا نہیں کہ دنیا کی دیگر مملکتوں، اور مملکتِ پاکستان میں ایک بنیادی فرق تھا۔ اور وہ فرق یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان درحقیقت ایک خطۂ ارض تھا جسے اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں قرآنی اقدار و اصولِ حیات کو ایک نظام کی شکل میں عملاً نافذ کیا جائے اور اس طرح دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ایک بار پھر بے نقاب کیا جائے کہ یہ نظام کس طرح نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت اور وجہ بالیدگی شرفِ انسانیت بنتا ہے۔ اس نظام کے متشکل ہو جانے کے بعد یہ مملکت اسلامی بن جائے گی۔

اب یہاں سے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ :

اس خطۂ زمین کی حفاظت

(۱) ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے تگ و تاز جسے آخر الامر اسلامی مملکت بنانا مقصود ہو، جہاد فی سبیل اللہ کہلائیگا یا نہیں۔ اور

(۲) جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس کی حفاظت مسلمانوں کے لئے عین دینی فریضہ قرار پا جائے گا یا نہیں۔ اور اگر دشمن اس پر حملہ کرے، تو اس کی مدافعت کے لئے جنگ، قتال فی سبیل اللہ سمجھی جائے گی یا نہیں۔ اور اس معرکہ میں جان دینے والے مقتولین فی سبیل اللہ، یعنی شہید کہلائیں گے یا نہیں؟ واضح ہے کہ "فی سبیل اللہ" سے مراد ہوتی ہے ان مقاصد کی خاطر جنہیں خدا نے متعین کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، دین کے تمکن کے لئے استخلاف فی الارض یعنی اسلامی مملکت کا قیام، خدا کا متعین فرمودہ مقصد ہے اور مقصد بھی اولین۔ اس لئے اس کے فی سبیل اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ؟

اب رہا اس مملکت کا تحفظ، سو قرآن کریم نے اس کی سرحدوں کی حفاظت (TERRITORIAL INTEGRITY) کی تاکید یہ کہہ کر کر دی کہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۔ (۸/۶۰) جس قدر قوت اور سامانِ حرب و ضرب تمہارے امکان میں ہو، اس سے اپنی مملکت کی سرحدوں کو مضبوط کرو تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمنوں کے دل میں تمہارا خوف طاری رہے اور وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ ان میں سے کچھ دشمن تو تمہارے سامنے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو ہنوز تمہارے سامنے نہیں آئے اس لئے ان کا تمہیں علم نہیں۔ خدا کو ان کے متعلق سب معلوم ہے۔ لہٰذا تم معلوم اور نامعلوم ہر قسم کے دشمن کی مدافعت کے لئے اپنی سرحدوں کو خوب مضبوط رکھو۔ یہ مجاہدین فی سبیل اللہ کا اولین فریضہ ہے اور

اگر دشمن آگے بڑھنے کی جرأت کرے تو پھر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ... (۲/۱۹۰) جو تمہارے خلاف آمادۂ جنگ ہوں ان سے جنگ کرو۔ تمہاری یہ جنگ "فی سبیل اللہ" ہوگی۔

مومن ہونے کی بنیادی شرط

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے مومن ہونے کی بنیادی شرط ہی یہ قرار دی ہے۔ آج تو ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جائے وہ مسلمان کہلاتا ہے اور جو غیر مسلم اسلام لانا چاہے اس سے کلمۂ شہادت پڑھوا کر اسے مسلمان کر لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ جو شخص مسلمان ہونا چاہے اسے ایک معاہدہ کرنا ہوگا جس کا فریق ثانی خود خدا ہوگا۔ وہ معاہدہ یہ ہے کہ — اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ یہ شخص اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت کی ضمانت دے دیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی زندگی کی ضمانت جس میں کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہو اور آخرت میں بھی جنت۔ اس معاہدہ کے بعد ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ۔ (۹/۱۱۱)۔ وہ (عند الضرورت) خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدان کارزار میں جان دے کر اپنے اس معاہدہ کی صداقت کی شہادت (گواہی) بہم پہنچا دیتے ہیں۔ انہی کو مقتولین فی سبیل اللہ یا عرف عام میں شہید کہا جاتا ہے۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ یہ سب کچھ اسلامی مملکت کی حفاظت کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اور پاکستان تو ہنوز اسلامی مملکت

پاکستان اسلامی مملکت نہیں

نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس مملکت کی حفاظت کے لئے جنگ 'قتال فی سبیل اللہ' اور اس جنگ میں کام آجانے والوں کو شہید کس طرح کہا جا سکیگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان ابھی تک اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ لیکن سوال اس خطۂ زمین کی حفاظت کا ہے جسے اسلامی مملکت بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ مملکت ابھی تک اسلامی نہیں بن سکی لیکن یہ آجتک کسی نے نہیں کہا کہ اسے اسلامی مملکت نہیں بنایا جائیگا۔ اس کے برعکس، یہاں ہر حکومت اور ہر آئین ساز ادارہ نے اس اقرار کو دہرایا اور اس کی توثیق کی ہے کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے اسے اسلامی مملکت بنایا جائے گا۔ جب تک اس مملکت کے باشندوں کا یہ عزم و اقرار ہے اس وقت تک اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے ہر کوشش 'جہاد فی سبیل اللہ' ہے اور اس مقصد کے لئے جان دے دینا 'شہادت'۔ اس کی نظیر خود تاریخ اسلام کا اولین باب ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کی تیرہ سالہ جد و جہد سے ایک جماعت تیار کی جس کا مقصد اسلامی مملکت کی تشکیل تھا۔ چونکہ اس مقصد کے لئے، مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا زیادہ سازگار تھی، اس لئے آپ نے اس طرف ہجرت فرمائی۔ اس ہجرت سے اسلامی مملکت کا قیام فوری طور پر عمل میں نہیں آگیا تھا۔ اس سے صرف اس کے امکانات روشن ہوئے تھے۔ قریش کے نزدیک اگر مسئلہ محض قومی یا وطنی ہوتا تو جب ان لوگوں (مسلمانوں) نے اس وطن کو چھوڑ دیا تھا، تو قریش کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن ان کی مخالفت اس نظام کے خلاف تھی جسے مسلمان قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ انہیں اس نظام میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے امنڈ آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ حملہ کسی اسلامی مملکت کے خلاف نہیں تھا۔ — اسلامی مملکت تو اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئی تھی — یہ حملہ اسلامی مملکت کے وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ اس لئے اس حملہ کا مقابلہ قتال فی سبیل اللہ تھا۔ بلکہ یہی وہ قتال (جنگ) تھا جس سے جماعت مومنین کو جنگ کرنے کی اجازت یا حکم کی ابتدا ہوئی تھی۔ (۲۲/۳۹) یہ جنگ بدر تھی اور ظاہر ہے کہ اس میں جان دینے والوں کے شہید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ انہوں نے تو اپنے مقدس خون کی روشنائی سے کتاب شہادت کی پہلی سطر رقم

فرمائی تھی۔

آغشتہ "اند" ہر سرِ خارے بخونِ دل　　　قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ "اند"

جنگ بدر اور جنگ ستمبر

جہاں تک احوال و کوائف کا تعلق ہے، جنگِ بدر اور پاکستان کی جنگِ ستمبر (۱۹۶۵ء) میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، وہ جنگ اسلامی مملکت کی حفاظت کے لئے نہیں لڑی گئی تھی۔ اس مملکت کے قیام کے امکانات کے تحفظ کے لئے لڑی گئی تھی۔ اس کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر حضور نبی اکرمؐ نے، عین میدانِ جنگ میں جب اسلام کی یہ کُل کائنات 'تین سو تیرہ سرفروش' اپنا سب کچھ تیاگ کر اپنے سے تین گنا لشکرِ جرّار کے سامنے صف آرا ہو چکے تھے، اس وقت آپؐ نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا کہ بار الہا! میں تیرے دین کے اس سارے سرمایۂ حیات کو لے کر اس میدان میں اتر آیا ہوں۔ اگر یہ تین سو تیرہ نفوس، جو بظاہر بڑے ہی ضعیف و ناتواں اور بے ساز و سامان ہیں، یہاں ختم ہو گئے تو دنیا میں، قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہیگا۔

عزیزانِ من! جہاں تک میری نگہ بصیرت میری یاوری کرتی ہے، دین کی ساری تاریخ میں، اس دعا کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ایک طرف دعا مانگنے والے کی رفعتِ مقام اور عظمتِ منصب کو سامنے رکھیے، اور دوسری طرف دعا مانگنے کے اس انداز پر نگاہ ڈالیے میں سمجھتا ہوں کہ اس حسنِ طلب کی داد، ذوقِ جبرئیل ہی دے سکتا ہے، اور اس لطافتِ کنایہ کی تحسین خدائے قدوس ہی کر سکتا ہے۔ اسی لئے تو اسداللہ خان نے کہا تھا کہ

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم　　　آں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی اس دعا میں حسن حسین و جمیل طریق سے خود خدا کے کائنات کو ایک فریق، اور فریق بھی فریقِ اعلیٰ بنا لیا گیا ہے، وہ بڑا وجد آفریں اور روح پرور ہے۔ کہنے والا کہہ رہا ہے کہ میں تو اپنی ساری کائنات تجھ پر نچھاور کرنے کے لئے لیکر حاضر ہو گیا ہوں — چہ کند بے نوا ہمیں دارد — اس سے زیادہ نہ ہمارے پاس کچھ اور ہے نہ ہم کچھ اور کر سکتے ہیں — سپردم بتو مایۂ خویش را — اب تو خود سوچ لے کہ اس پونجی سے تو نے کیا کام لینا ہے۔ اگر اسے یہیں ختم کر دینا ہے تو اس کے بعد تو جان تیرا کام۔ ہم تو یہ سب کچھ لٹا کر چلے جائیں گے کہ ہم آئے ہی اس نیت سے ہیں۔ لیکن اس کا جو نتیجہ ہوگا، اسے تو خود دیکھ لے۔ یہ ہمارا کام نہیں، تیرا کام ہے۔ آپ نے غور فرمایا، برادرانِ عزیز! کہ اس معصوم اور حسین دعا میں، خدا پر کتنی بڑی ذمہ داری عاید کر دی گئی ہے۔ یہ مقام ایسی ہی بلند ہستی کو حاصل ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ حضورؐ کی یہی وہ دعا تھی جس سے، شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اقبالؒ نے اپنی وہ مشہور غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے کہ:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا　　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اور مقطع ہے کہ:-

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن　　　زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

لیکن اس میں، اور اس دعا میں وہی فرق ہے جو شاعر اور نبی میں ہوتا ہے — اقبالؒ کے ہاں شکوہ ہے، طنز ہے، شوخی ہے۔ لیکن اس دعا کی جو بات ہے اسے، کم از کم میں تو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ — اما تو چیزے دیگری!

ہاں! یہ تھی جنگِ بدر کی اہمیت۔ اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں، عزیزانِ من! بلا تمثیل عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ

جنگِ ستمبر کی اہمیت

کم و بیش یہی اہمیت اصولی طور پر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کی تھی۔ ہمارے مجاہدین جانفروش اپنی ساری متاعِ حیات لے کر میدانِ کارزار میں، شمشیر بدست اور کفن بدوش آنکلے تھے اور یہ کہہ کر آنکلے تھے کہ:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

سوچئے برادرانِ عزیز! اگر اس جنگ میں انہیں شکست ہو جاتی تو پھر دنیا میں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات کے چراغ گُل ہو جاتے۔ انہوں نے اُس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جانیں دی جسے اعلائے کلمۃ الحق کا ذریعہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے ان کی موت، شہید کی موت ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنگِ بدر و اُحد میں شریک ہونے والے صحابہ کبارؓ تھے جن کے (صحابی ہونے کی جہت سے) علو مرتبت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جہاں تک خدا کی راہ میں جان دے کر حیاتِ جاوداں حاصل کر لینے کا تعلق ہے، مبداءِ فیض کی اس نوازشِ بے پایاں کے دروازے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ یہ واقعہ بھی تو جنگِ اُحد ہی کا ہے کہ عمروؓ بن ثابت، جو اصیرمؓ کے نام سے مشہور تھے، غزوۂ اُحد کے دن اسلام لائے۔ تلوار ہاتھ میں لی اور سیدھے میدان میں جا پہنچے۔ جانفروشانہ لڑے اور تبسم نثار جان دے دی۔ حضورؐ نے ان کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔ کہ اصیرمؓ کس قدر خوش نصیب ہے کہ اس نے ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی لیکن سیدھا جنت میں پہنچ گیا۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

دوسری طرف یہ واقعہ بھی اسی جنگ کا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا، قزمانؔ نامی۔ اس کی مذموم حرکات اس قدر واضح تھیں کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ غزوۂ اُحد کے دن یہ قریش کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا اور دشمن کے سات آٹھ افراد کو قتل کیا۔ صحابہؓ اس کی بہادری پر خوش تھے۔ وہ زخمی ہوا تو وہ اس کے پاس گئے اور کہا کہ قزمان! ہم تم کو خوشخبری دیتے ہیں کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ اس نے کہا کہ خوشخبری کا ہے کی۔ یہ تو مکہ اور مدینہ والوں کی قومی جنگ تھی۔ مجھے قومی حمیت نے ابھارا۔ اس لئے میں میدان میں آ گیا۔ یہ نہ ہوتا تو میں کبھی نہ آتا۔ اس سے صحابہؓ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے جان دے دینے والا بہرحال مغفرت و رحمت کا سزاوار نہیں ہو جاتا۔ شہادت اسی کی ہے جو فی سبیل اللہ جان دے۔ اس سے دین اور وطن کا بنیادی فرق سامنے آ جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں، جو آزادیٔ وطن کو مقصودِ اسلام قرار دیتے تھے، فرمایا تھا کہ:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا مقصدِ اولین یہ ہے کہ اسلام قائم رہے، اور مسلمان طاقتور بن جائے ۔۔۔۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے اور ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔"

یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے تحریکِ پاکستان کو "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا اور اسی حقیقت کو قائداعظمؒ

نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

"پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف آزادی حاصل ہی نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

(فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام پیغام۔ جون ۱۹۴۵ء)

اور یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے جان دینا شہادت ہے۔ لہٰذا جب تک اس خطۂ زمین کے رہنے والوں کا یہ فیصلہ برقرار ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا، اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش جہاد ہے اور اس مقصد کے لئے جان دے دینا عین شہادت۔ اور فاتح و منصور واپس لوٹنا باعثِ اجرِ عظیم۔ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (۴/۷۴) جو بھی فی سبیل اللہ لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں جائے۔ پھر وہاں جان دیدے یا غالب و فاتح حیثیت سے واپس لوٹے، ان سب کے لئے "اجرِ عظیم ہے" اور اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ موت "دشمن کی تلوار ہی سے واقع ہو۔ نبی اکرمؐ نے مومن کی زندگی کے متعلق فرمایا ہے کہ:-

جب جہاد (قتال) ہو رہا ہو تو وہ اس میں شریک ہو، اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔

لہٰذا اگر وہ جنگ کے لئے جا رہا ہو اور راستہ ہی میں موت آجائے۔ یا وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہے لیکن اس کی زندگی میں

اس راہ میں موت

جنگ کی نوبت نہ آئے اور وہ ایسے ہی طبعی موت مر جائے تو بھی اس کے لئے مغفرت اور رحمت خداوندی کا وعدہ قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (۳/۱۵۶)

اگر تم اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہوئے قتل ہو جاؤ، یا ویسے ہی مر جاؤ، تو تمہارے لئے مغفرت اور رحمت کی بشارت ہے اور یہ سرمایۂ دنیا کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا ہے۔

لہٰذا جب تک یہ خطۂ زمین "نظامِ خداوندی کے قیام کا ذریعہ قرار پاتا ہے" اس کی حفاظت کی ہر کوشش جہاد ہے۔ ہاں اگر بدقسمتی سے، قوم اپنے اس دعوے سے پھر گئی، تو پھر یہ مملکت بھی دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح قومی مملکت بن کر رہ جائے گی اور اس کی حفاظت ایک قومی فریضہ قرار پائے گی۔ دینی فریضہ نہیں۔ لیکن جن مجاہدین و مقتولین فی سبیل اللہ کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کے غازی اور شہید ہونے میں کیا کلام ہے۔ درخورِ صد رشک ہے ان کی زندگی اور موجبِ صد ہزار افتخار ہے اُن کی موت — وہ موت جس پر کروڑوں زندگیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں۔ راجستھان، چھمب، کرن، بیدیاں، برکی، واہگہ، لیبر، جونڈہ سیالکوٹ کی زیارت گاہیں ان شہیدانِ مقدس خون سے ایسے لالہ زاروں میں تبدیل ہو چکی ہیں جن پر کبھی خزاں نہیں آ سکتی۔ یہ انہی لالہ زاروں کا صدقہ ہے جو ہم آج دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں۔

اے اپنی جان کی قیمت دے کر ہمارے لئے زندگی خریدنے والو! ملتِ پاکستانیہ اپنی جھکی ہوئی نگاہوں سے تمہاری بارگاہ میں ہزاروں سلام اور لاکھوں احترام پیش کرتی ہے۔ ہمارے اس نذرانۂ عقیدت و خراجِ محبت کو قبول فرمائیے۔

نئی جنگ کا آغاز

عزیزانِ من! ہم ۱۹۶۵ء کے بعد ہر سال اس عظیم تقریب کو مناتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم ان جانثارانِ ملت کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ان اجتماعات کو ختم کر دیا کرتے تھے۔ لیکن امسال اس تقریب کا اختتام یہیں پر نہیں ہو جاتا۔ یہ بلکہ تمہید بنتی ہے ایک ایسی تقریب کی ـــ وہ تقریب جو میرے نزدیک اس پہلی تقریب سے کچھ کم اہم اور عظیم نہیں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد، اُس زمانے کے بھارت کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

"پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اُسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، یہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

اور بھارت نے یہ تیاری اُسی دن سے شروع کر دی۔ البتہ اس کی تدبیر (STRATEGY) بدل دی۔ اس نے دیکھا کہ سابقہ جنگ میں اسے اس لئے شکست ہوئی تھی کہ پاکستان کی شہری آبادی کا بچہ بچہ ملک کا بہی خواہ اور فوج کا ہمنوا تھا۔ اس لئے

غداروں کا ٹولہ

آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے اندر غدار پیدا کئے جائیں ـــ اور یہ غدار انہیں آسانی سے مل گئے۔ اس ٹولے کا سرغنہ شیخ مجیب الرحمٰن تھا۔ چونکہ اس شخص کے خلاف آجکل مقدمہ زیرِ سماعت ہے اس لئے میں اس کے مبینہ جرائم کے سلسلہ میں کسی قسم کی تنقید نہیں کروں گا، اور اپنے آپ کو صرف ان واقعات تک محدود رکھوں گا جو حکومتِ پاکستان کی طرف سے شائع کردہ قرطاسِ ابیض (وہائٹ پیپر) میں مذکور ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ انڈیا نے، مجیب کو ساتھ ملا کر، اس سازش کی ابتدا ستمبر ۱۹۶۵ء سے کر دی تھی۔ لیکن چونکہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہنوز وہ اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھی اس لئے اس کے کوئی تخریبی اثرات اس جنگ میں نمودار نہ ہو سکے۔ ۱۲ جولائی ۱۹۶۷ء کو انڈیا کے نمائندگان اور مجیبی ٹولہ کے سازشیوں کے مابین، اگرتلہ کے مقام پر خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں طے پایا کہ یہ غدار، مشرقی پاکستان میں علمِ بغاوت کھڑا کر دیں جس کے لئے سامان اور اسلحہ ہندوستان مہیا کرتا جائے گا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں اس سازش کا راز افشا ہو گیا اور اس کے سرغنے گرفتار کر لئے گئے۔ اس سلسلہ میں تفتیش کے بعد یہ پتہ چلا کہ اس سازش کی ایک شق یہ بھی تھی کہ اعلانِ بغاوت کے ساتھ ہی انڈیا ایسا انتظام کریگا کہ مغربی پاکستان سے آنے والے بری اور بحری راستے اس طرح مسدود کر دیئے جائیں کہ وہاں سے مشرقی پاکستان کو کوئی کمک نہ پہنچ سکے اور مشرقی پاکستان میں متعین پاکستانی فوج کا خاتمہ کر کے اس کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس سازش کے انکشاف پر مجیب اور اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اگر وہ مقدمہ اختتام تک پہنچ جاتا اور مجرمین کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جاتا تو اس سازش کی وہیں جڑ کٹ جاتی۔

مجیب کی رہائی

لیکن اس ملک کی انتہائی بدقسمتی کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ان واقعات کا ہر ایک کو علم ہے کہ کس طرح حکومت پر زور ڈالا گیا کہ اس مقدمہ کو واپس لیا جائے اور مجیب اور اس کے ساتھیوں کو بلا شرط رہا کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور مجیب جو سازش جیسے سنگین جرم میں ماخوذ عدالت کے کٹہرے میں تھا، ملک کا ہیرو بن گیا۔ یہ اس سازش میں انڈیا کی پہلی کامیابی تھی۔

یہ اوائل ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد کامل دو برس تک، انڈیا اور مجیب کی باہمی سازش سے اس بغاوت کی تیاریاں

ہوتی رہیں، اور جب انہیں اس کی کامیابی کا اطمینان ہو گیا تو مارچ ۱۹۷۱ء میں یہ کھل کر سامنے آ گئے۔ اس وقت دیکھا گیا کہ ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور بھارت کی سپاہ ملا کر قریب دو لاکھ مسلح فوج مشرقی پاکستان میں باغیوں کی حمایت کے لئے موجود تھی۔ جن کے مقابلہ کے لئے حکومت پاکستان کی چند ایک بٹالین پر مشتمل فوج تھی۔ اور مغربی پاکستان کی طرف سے انڈیا کے اوپر سے، ہوائی جہازوں کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ یکم مارچ سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک، وہ بدنصیب ملک ان باغیوں کے تسلط میں رہا۔ ان پچیس دنوں میں، ان درندوں نے وہاں کی نہتی شہری آبادی کے خلاف جس قسم کی وحشت اور درندگی کا مظاہرہ کیا، اس کی تفاصیل مختلف اخبارات اور حکومت کی طرف سے شائع شدہ وہائٹ پیپر کے ذریعے آپ کے علم میں آ چکی ہیں۔ میں اس وقت، ان میں سے چند ایک واقعات کو دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ آپ پر واضح ہو جائے کہ وہ کونسے حالات تھے جن سے مجبور ہو کر، ہماری مایۂ ناز فوج کے سرفروشوں کو اپنی بارکوں سے باہر آنا پڑا۔ اور انہوں نے کیا کارہائے نمایاں کر کے دکھائے۔ میں جن واقعات کا تذکرہ آپ کے سامنے کر رہا ہوں، وہ سنی سنائی خبروں پر مبنی نہیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کا ذکر حکومتِ پاکستان نے اپنے قرطاسِ ابیض میں کیا ہے، یا جن کی انہوں نے پہلے ہی تصدیق کی تھی۔ یہ بھی واضح ہے کہ ان واقعات کے تذکرہ سے (خدانکردہ) کسی قسم کے جذبات نفرت و انتقام کا مشتعل کرنا مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جب ملک کا غدار اور باغی طبقہ قانون اور قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو پھر وہاں کی مظلوم، امن پسند آبادی پر کیا بیتتی ہے۔ ان بیانات کے مطابق، ان پچیس دنوں میں:

مظالم کی تفصیل

(۱) باغیوں نے قریب ایک لاکھ سے زیادہ بے گناہ نہتے شہریوں کا قتلِ عام کیا۔

(۲) بوگرہ ضلع میں سانتاہار کے مقام پر قریب پندرہ ہزار مردوں کو گھیرے میں لے کر منظم طریق سے قتل کیا گیا۔ عورتوں کو ننگا کر کے، سڑکوں پر پھرایا گیا اور بیکس ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔

(۳) چاٹگام میں دس ہزار افراد کو تلوار کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ ان میں ایک چھوٹے سے محلے کی اٹھائی سو عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جنہیں سنگینیں بھونک کر ہلاک کیا گیا۔

(۴) پبنہ کے قریب سراج گنج میں ساڑھے تین سو عورتوں اور بچوں کو ایک ہال میں بند کر کے آگ لگا دی گئی اور وہ سب جل بھن کر خاک ہو گئے۔

(۵) میمن سنگھ کے علاقہ میں دو ہزار خاندانوں کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ وہاں کے مردوں کو گھروں سے باہر لیجا کر گولی مار دی گئی اور عورتوں کی عصمت دری کرنے کے بعد انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی قبریں اپنے ہاتھوں سے کھود لیں۔

(۶) ایسٹ پاکستان رائفلز نے جب بغاوت کی تو اس فوج کے قریب چالیس فیصد افراد مغربی پاکستان کے تھے جن میں بیشتر افسر تھے۔ باغیوں نے انہیں تہ تیغ کیا اور ان میں سے بیشتر کی لاشیں ہندوستان کے سرحدی شہر ہری داس پور کے قریب ٹھکانے لگا دیں۔

(۷) اصفہانی خاندان کی ملکیت، پٹ سن کے ایک کارخانے میں، ڈیڑھ سو کے قریب، ان عورتوں اور بچوں کی قبریں دیکھی گئیں جنہیں کارخانے کے کلب میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ بچوں کے خون آلود کپڑے اور ان کے کھلونے، کلب کے فرش پر بکھرے پڑے ان وحشیوں کی درندگی کی پکار کر رہے تھے۔ غلاظت کے ڈھیر میں سے ایک بچی کی گڑیا تو ملی لیکن خود اس بچی کا کچھ پتہ نشان نہ مل سکا۔

(۸) چاٹگام میں ایک جلی ہوئی عمارت دیکھی گئی جس میں ساڑھے تین سو پٹھانوں کو بند کر کے، جلا دیا گیا تھا۔

(۹) ٹھاکر گاؤں کی آبادی کی اکثریت کو ہلاک کر کے، نوجوان لڑکیوں کا اغوا کیا گیا۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور جو حاملہ نظر

آتیں انہیں سنگینوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جو بچے مردہ پیدا ہوئے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ لاشوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔

(۱۰) ایک اکاؤنٹس کلرک نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو اسے تا بہ کمر زندہ زمین میں گاڑ دیا اور پھر لاٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔

(۱۱) ان ہنگاموں میں زندہ انسانوں کی آنکھیں نکالی گئیں۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹی گئیں۔ چٹاگانگ میں ملٹری اکادمی کے کرنل کمانڈنٹ کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کی آٹھ ماہ کی حاملہ بیوی کی پہلے عصمت دری کی گئی۔ پھر اس کے پیٹ میں سنگینوں کے کچوکے دیدے کر اسے تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ ایک اور فوجی افسر کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ اس کے لڑکوں کے سر تن سے جدا کئے گئے اس کی بیوی کے پیٹ میں سنگینیں گھونپ کر اس طرح مارا گیا کہ اس کے بچے کا سر اس کے برہنہ جسم کے اوپر دھرا تھا۔

میں عزیزانِ من! کہاں تک بیان کرتا جاؤں کہ اس بدنصیب خطۂ زمین کی سوختہ بخت مکین دبے بس آبادی پر کیا گزری! جو کچھ ان پر گزری اسے ہم نے کسی نہ کسی طرح سنا، اور دل پر پتھر رکھ کر برداشت بھی کیا۔ لیکن برادرانِ گرامی قدر! سبعیت و بربریت کی اس الم انگیز اور جگر پاش داستان میں ایک واقعہ ایسا ہے جسے، نہ مجھ میں بیان کرنے کی تاب ہے، نہ آپ میں سن سکنے کی ہمت۔ لیکن اس کے باوجود۔ مجھ

جوان لڑکیوں کو ہندوستان بھیجدیا

ہرماں نصیب کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ میں اسے باچشمِ خونفشاں بیان کروں اور آپ اسے باقلبِ سوختہ سنیں۔ اور وہ جگر پاش واقعہ یہ ہے کہ دیناج پور میں جب یہ درندے، مردوں، عورتوں، بچوں کا قتلِ عام کر چکے اور مقتولین کے سروں کی نمائش درختوں پر لٹکا کر، ان کی بیکسی کا تماشا دیکھ چکے، تو بقیہ آبادی میں سے انہوں نے تقریب چار سو نوجوان لڑکیوں کو چنا اور انہیں ہندوستان کیطرف دھکیل دیا کہ وہ وہاں فوج کے سپاہیوں کی ہوسناکیوں کا نشانہ بنیں۔

اے محمد! اگر قیامت را براری سرز خاک
سربرار و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

ہم نے تقسیم ہند کے ضمن میں اُدھر سے آنے والے خانماں خراب قافلوں کے متعلق سنا کہ راستے میں کس طرح ہندو اور سکھ ہماری جوان بیٹیوں اور بہنوں کو چیختے چلاتے جھپٹ کر لے گئے۔ ہمارے سینے کے وہ داغ ابھی تک مندمل نہیں ہوئے تھے۔

پھر ہم نے یہ قیامت خیز خبریں بھی سنیں کہ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں سکھوں کی فوجیں کس طرح ہمارے بارڈر کے بعض گاؤں کی عورتوں کو اٹھا کر لے گئیں۔ ان بے بس بچیوں اور بہنوں کی یاد میں بہنے والے ہمارے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے۔

کہ اب یہ قیامت خیز واقعہ ہمارے سینے کو چیر گیا۔ اس حادثہ کی الم انگیزی اور خونناب فشانی، ان زہرہ گداز واقعات کے مقابلہ میں اس لئے زیادہ شدید ہے کہ وہاں ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو غیر مسلم جھپٹ کر لے گئے تھے لیکن یہاں خود مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو غیر مسلم درندوں کے حوالے کر دیا!

یہ تھے عزیزانِ من! وہ حشر انگیز واقعات جن سے مجبور ہو کر ہمارے ان سرفروشوں سے کہا گیا کہ وہ اٹھیں اور اپنی جان دے کر قوم

نہایت جرأت آزما مرحلہ

کے مظلوم بچوں کی جانیں، اور ملت کی معصوم بیٹیوں کی عصمتیں بچالیں۔ آپ ذرا اس منظر کو سامنے لایئے، عزیزانِ من! کہ یہ کل بارہ بٹالین پر مشتمل افراد تھے جن کے سامنے دو لاکھ مسلح فوج تھی اور یہ فوج اُس ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی جس میں بغاوت عام ہو رہی تھی اور انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم جب دشمن کی سرکوبی کے لئے آگے بڑھیں گے، تو پیچھے سے ہماری پیٹھ میں کون خنجر گھونپ دیگا۔ ہمارے ان جیالے نوجوانوں

کی مہم یقیناً ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کہیں زیادہ دشوار اور یہ مرحلہ اُس سے کہیں بڑھ کر ہمت طلب اور جرأت آزما تھا۔ جب فوج کو معلوم ہو کہ پورے ملک کی آہنی دیوار اس کی پشت پر ہے تو اس کے حوصلے کہکشاں گیر اور اس کی ہمتیں ثریا بوس ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب فوج اس ملک میں کھڑی ہو جس میں دائیں بائیں غدارانِ قوم پھیلے ہوئے ہوں، تو وہاں جم کر کھڑے ہونا بڑی حوصلہ مندی کا کام ہے ۔۔ اور پھر کھڑے ہونا بارہ بٹالین نفری کا دو لاکھ فوج کے سامنے!

اور یہ قابلِ صد فخر فرزندانِ ملت، وہاں جم کر کھڑے ہی نہیں ہوئے، انہوں نے چند دنوں کے اندر اس سازش کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور ملک کو پھر سے اپنے تسلط میں لے لیا۔

کہیئے عزیزانِ من! کہ کیا یہ محیر العقول واقعہ ایسا نہیں کہ اس کی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رکھی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مملکتِ پاکستان کی تاریخ میں، واقعات ہی دو ہیں جن کی یاد کو ملت کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے ۔۔ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء، اور مدافعتِ مارچ ۱۹۷۱ء۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ غیر مسلموں کے خلاف تھی اس لئے اسے تو جہاد یعنی "قتال فی سبیل اللہ" کہا جا سکتا ہے، لیکن مشرقی پاکستان میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی، اسے کس طرح قتال فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ یہ خیال اگر دانستہ غلط فہمیاں پیدا کرنے اور ہماری افواجِ قاہرہ کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کے لئے وضع نہیں کیا گیا تو حقائق سے لاعلمی پر ضرور مبنی ہے اور نتیجہ اس کا بھی بہرحال وہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کی جائے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بقا کے لئے جنگ از روئے قرآن قتال فی سبیل اللہ اور اس میں جان دینا شہادت ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ پاکستان کے دشمن خود اس ملک کے اندر غدار پیدا کر کے بغاوت پھیلا دیں اور اس طرح اس مملکت کو ختم کرنے کی سعی مذموم کریں تو کیا ان باغیوں کے خلاف جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ نہیں ہوگا؟ باغیوں کے متعلق تو قرآن کریم کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ ۔۔ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (۵/۳۳)۔ جو لوگ خدا اور رسول یعنی اسلامی مملکت کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور ملک میں فساد اور لاقانونیت پھیلانے کی کوشش کریں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ سزا ان کے لئے اس دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی اور آخرت میں وہ عذابِ عظیم میں ماخوذ ہوں گے۔

خود صدرِ اول میں، اسلامی مملکت میں ایسے لوگ موجود تھے جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے لیکن مملکت کے خلاف تخریبی کاروائیاں کرتے رہتے تھے۔ قرآن کریم نے انہیں منافقین کہہ کر پکارا اور رسول اللہ سے تاکیداً کہا کہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (۹/۷۳)۔ اے نبی! تم ان منافقین کے خلاف بھی اسی طرح جہاد کرو جس طرح کفار کے خلاف جہاد کیا جاتا ہے اور اس فتنہ کو سختی سے کچل دو۔

مملکت کے خلاف بغاوت کی حدیں کہاں تک پھیلتی ہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے جو رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رض کے زمانے میں پیش آیا۔ واقعہ یہ تھا کہ بعض قبائل نے یہ کہا کہ جو ٹیکس (زکوٰۃ) مرکز کے خزانے

ہیں جانا چاہیئے۔ ہم اسے مرکز میں نہیں بھیجیں گے بلکہ اپنی صوابدید کے مطابق، مقامی طور پر خرچ کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے مرکز کے خلاف بغاوت قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ اگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے تو ان کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ "خدا کی قسم جب تک اونٹ کی ایک رسّی جسے بیت المال میں پہنچنا چاہیئے، یہاں نہیں پہنچ جائے گی میں اس جنگ کو جاری رکھوں گا۔" مسلمانوں کے خلاف اسلامی فوج کی جنگ کی اس سے بڑی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو (بدبخت) مسلمان، اسلامی مملکت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دے، وہ مسلمان رہتا ہی کب ہے؟

یہ تو کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قرآن کریم نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد، ان میں سے کوئی گروہ، شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کرتا ہوا دوسرے گروہ پر چڑھ دوڑے تو تم اس گروہ کے خلاف جنگ کرو تاآنکہ وہ خدائی فیصلہ کے سامنے جھک نہ جائے۔ (۴۹/۹) یہ جنگ بھی اسلامی افواج کی خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے خلاف ہو گی۔

اور قرآن کریم کا یہ حکم بھی تو ہمارے سامنے ہے کہ جب بیکس و بے بس، مظلوم، مرد، عورتیں، بچے، ظالم کے ظلم کے خلاف فریاد کریں تو مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی مدد کے لئے اٹھیں اور ظالم کے خلاف جنگ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ظلم و تشدد کرنے والے خواہ مسلمان ہوں اور خواہ غیر مسلم، مظلوموں کو ان کے پنجۂ استبداد سے چھڑانا اسلامی افواج کے لئے فریضۂ خداوندی ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں، خود مسلمانوں کا مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنا، قتال فی سبیل اللہ قرار پا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالیہ قیامت خیز واقعات میں یہ اسباب (و شرائط کم و بیش) سب کے سب یکجا جمع ہو چکے تھے۔ پھر ان مسلمان باغیوں، مفسدوں، ظالموں کے خلاف، افواج پاکستان کا جنگ کرنا کس طرح قتال فی سبیل اللہ نہیں کہلائے گا۔ اور اس جنگ میں جان دینے والے کیوں شہید نہیں قرار دیئے جائیں گے۔

بنابریں، مدافعت مارچ ۱۹۷۱ء کے جاں نثار و جانباز اسی انداز کے شہید ہیں جس نہج کے شہید جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے مقتولین تھے، اور دونوں اس قابل کہ ان کی یاد نہایت عقیدت و احترام سے منائی جائے۔ اسی لئے ہم نے آج کے اس اجتماع کو ان تمام شہیدوں کی مشترکہ یادگار کی تقریب قرار دیا ہے۔

جنگ ستمبر کے مجاہدین

لیکن ان دونوں یادگاروں میں بھی ایک نمایاں فرق ہے۔ جنگ ستمبر میں کیفیت یہ تھی کہ سپاہی جن سڑکوں پر سے گزرتے تھے لوگ انہیں پھولوں سے آراستہ اور جھنڈیوں سے پیراستہ کرتے۔ جگہ جگہ دودھ کی سبیلیں لگاتے۔ دیگیں پکواتے۔ فوجیوں کی گاڑیوں پر پھول برساتے، ان کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے۔ میدانِ جنگ میں کسی توپچی کے گولے سے دھماکہ ہوتا تو ملک بھر میں تکبیر کے نعروں کے غلغلے بلند ہو جاتے۔ کوئی سپاہی زخم کھا کر گرتا تو مسجدوں اور خانقاہوں میں اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگی جاتیں۔ کسی کی شہادت کی خبر آتی تو شہید کی ماں کے لئے مبارک بادی کے تاروں کا تانتا بندھ جاتا۔ دھوم سے ان کے جنازے اٹھتے اور نہایت تزک و احتشام سے انہیں سپردِ خاک کیا جاتا۔ ان کے شایانِ شان مزارات بنتے اور یادگاریں قائم ہوتیں۔ ان کی بہادری کے کارناموں کے اعتراف میں ان کے سینے تمغوں سے سجائے جاتے۔ اور انہیں معزز القابات سے نوازا جاتا۔ ان کی بیواؤں کے اعزاز میں قوم اپنی آنکھوں کو فرشِ راہ بناتی اور انہیں انتہائی عزت و احترام کے مقام پر بٹھاتی۔ ان کی معرکہ آرائیوں کے تذکروں پر مشتمل کتابوں کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ریڈیو پر ان کی شان میں ترانے گائے گئے، جن کی صدائے بازگشت آج تک ملت کے لئے وجۂ ارتعاشِ قلب بنتی ہے۔ ان کے نام ان کی یادگاروں کی الواح پر منقوش اور ان کے سنگِ مزارات پر محفوظ کئے گئے۔ اور پھر اس وقت سے آج تک ان کی یاد میں تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ قوم ہر سال ان کی

بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتی اور یوں دنیا میں ان کے کارنامے زندہ رکھتی اور ان کا نام روشن کرتی ہے۔ یہاں کا حق تھا جسے قوم بصد احترام و عقیدت ادا کرتی ہے۔

مارچ ۱۹۷۱ء کے مجاہدین

لیکن اس کے برعکس مارچ ۱۹۷۱ء کے مجاہدین اور شہداء کی یہ کیفیت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا نام تک باہر نہیں آیا۔ کسی کو علم تک نہیں کہ وہاں انہوں نے کیا معرکے مرکئے اور کس حسن تبسم سے اپنی جانیں دیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وہاں جنگ ستمبر سے کم جانیں قربان نہیں ہوئیں، لیکن ملک میں ان کا کہیں ذکر تک نہیں۔ نہ کسی نے ان کی بہادری کا چرچا کیا، نہ اس کے اعتراف کے طور پر انہیں تمغات سے نوازا گیا۔ نہ ان کی تحسین و آفرین کے ترانے گائے گئے، نہ ان کی شان میں کوئی قصیدے پڑھے گئے۔ نہ ان شہیدوں کے دھوم سے جنازے اٹھے، نہ ان کے شاندار مزارات تعمیر ہوئے۔ نہ ان کی ماؤں کو مبارکبادیاں ملیں، نہ ان کی بیواؤں کو کسی نے پرسا تک دیا۔

معلوم نہیں اس میں حکومت کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے کہ قرطاس ابیض میں بھی ان کا کوئی ذکر تک نہیں آیا۔ صدر مملکت نے اپنی ۲۸ جون کی تقریر میں اتنا کہا تھا کہ "قوم ان مسلح افواج پر فخر کرتی ہے اور وہ اس کی تحسین و تبریک کی پوری پوری مستحق ہیں" اس سے زیادہ تفصیل انہوں نے بھی نہیں بتائی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے حق میں بڑی بے انصافی ہے اور قوم کو ان کی یاد سے محروم رکھنا اس کی حرماں نصیبی۔ ان کا حق ہے کہ جنگ ستمبر کے شہدا کی طرح ان کی یادگاریں قائم کی جائیں اور قوم کو ان کی جرأت و بسالت کے کارناموں سے آشنا کرایا جائے۔ انہوں نے اپنی جانیں دے کر پاکستان کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس لئے یہ انتہائی احسان فراموشی ہو گی اگر قوم ان کی ان مایہ ناز قربانیوں کو فراموش کر دے اور انہیں وہ مقام عطا نہ کرے جسے انہوں نے اپنے خون کی قیمت ادا کر کے حاصل کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب موجودہ بحران کا خاتمہ ہو جائے گا، تو ان معرکوں کی جملہ تفاصیل قوم کے سامنے لائی جائیں گی۔ سردست ہم ان گمنام جاں فروشوں کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ:

معرکۂ مارچ ۱۹۷۱ء کے غازیو اور شہیدو! تم پر خدا کی رحمتوں اور بشارتوں کے سحاب کرم کا ابدًا ابدًا سایہ رہے۔ قوم تمہاری بلند و بالا بارگاہ میں ہزار ہزار عزت و احترام کا پرخلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔

مجیب کا انجام

جہاں تک غدارِ ملت، مجیب کا تعلق ہے، اس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اس کا قانونی فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی لیکن قوم اپنا فیصلہ بہت پہلے سے دے چکی ہے اور وہ یہ کہ شہدائے مشرقی پاکستان کے ساتھ اس غدار ازلی کی یادگار کا قائم رکھنا بھی ضروری ہو گا۔ اس کی یاد کیسے قائم کی جائے گی، اس کے لئے ہمارے سامنے ایک نظیر موجود ہے۔ مکہ سے طائف کو جاتے ہوئے راستہ میں، مغمس کے مقام پر ایک قبر ہے، ہر عرب جو وہاں سے گذرتا ہے اس قبر پر کنکریاں مار کر گزرتا ہے۔ یہ قبر کس کی ہے اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ بات سننے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں، سورۃ الفیل میں، ہاتھیوں والے کی مہم کا ذکر ہے۔ یہ ہاتھیوں والا، یمن کا گورنر ابرہہ تھا۔ اس نے مکہ پر چڑھائی کی تو پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک ایسا خفیہ راستہ اختیار کیا جس کا علم عربوں کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پر اچانک حملہ بول دیا جائے۔ اس نے تو ایسی احتیاط برتی لیکن فطرت کے جاسوسوں، گدھوں چیلوں نے اس کا راز فاش کر دیا۔ ان پرندوں کو جبلی طور پر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ لشکر جو کہیں جا رہا ہے تو اس کے ساتھ ضرور ہو لینا چاہیئے کیونکہ اس سے انہیں بہت سی خوراک مل جائے گی۔ چنانچہ یہ اوپر سے منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لئے۔ تو اہل مکہ نے بھانپ لیا کہ پیچھے کوئی لشکر آ رہا ہے۔ وہ پہاڑیوں پر چڑھے اور اوپر سے بڑے بڑے پتھر اس طرح لڑھکائے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کا بھرکس نکل گیا۔ اہل مکہ کو، اس کی مہم ناکام بنا دینے کے بعد، اس بات کی پرجول

ہوئی کہ یہ خفیہ راستہ اسے کس نے بتایا تھا۔ تفتیش کے بعد انہیں پتہ چلا کہ ان میں ایک غدار ابورغال ثقفی تھا جس نے اس لشکر کی راہ نمائی کی تھی۔ یہ قبر اسی کی ہے جس پر آج تک ہر عرب پتھر مار کر گزرتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انہوں نے باقی تین غداروں کو پکڑ کر سنگسار کر دیا تھا۔ یہ واقعہ تو ایک دن میں گزر گیا لیکن انہوں نے ضروری سمجھا کہ آنے والی نسلوں کو بھی معلوم ہوتا رہے کہ غدارانِ قوم کا حشر کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے سنگساری کے مقام پر تنفیر کا ڈر کرنشانات بنا دیئے اور یہ قومی شعار بنا لیا کہ حج کی تقریب پر ان غداروں کی یادگاروں پر پتھر مارے جائیں۔ یہ جو حج کے موقعہ پر "شیاطین" کو کنکریاں ماری جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اسی واقعہ کی یادگار ہے[1] ضرورت ہے کہ جب شہدائے مشرقی پاکستان کی یاد منائی جائے تو اس کے ساتھ ہی ان غداروں کے انجام کو بھی سامنے لایا جائے تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کے ذہن میں اس حقیقت کی یاد تازہ ہوتی رہے کہ

ملتے را ہر کجا غارت گرے است   اصلِ او از صادقے یا جعفرے است[2]

الاماں از روحِ جعفر الاماں   الاماں از جعفرانِ ایں زماں (اقبالؒ)

آخر میں عزیزانِ من! مجھے اس عظیم فریضہ کو ادا کرنا ہے جس کے لئے آپ بھی ہمہ تن انتظار ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ

شہید راشد منہاس

کہا ہے کہ میرے لئے سب سے زیادہ کرب انگیز اور اذیت رساں یہ احساس ہے کہ اپنے سیاہ نامۂ اعمال کے ساتھ روزِ محشر حضور سرورِ کائنات کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا۔ اسی لئے انہوں نے خدا سے التجا کی تھی کہ اگر میرا حساب لینا ہی ہو تو۔۔۔ از نگاہِ مصطفٰے پنہاں بگیر ۔۔۔ میں عزیزانِ من! جب اپنی قوم کے ان غداروں کا تصور کرتا ہوں تو اسی قسم کا احساس مجھے بھی غرقِ ندامت کر دیتا ہے کہ جب میدانِ محشر میں ملتِ پاکستانیہ حضورؐ کی امت کی حیثیت سے پکاری جائے گی تو اس میں ہجوم در ہجوم اور انبوہ در انبوہ غداروں کی موجودگی عالمِ انسانیت میں ہماری کس قدر ذلت و رسوائی کا موجب بنے گی اور حضورؐ کو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔

لیکن اقبال ہی نے اس قدر نادم و شرمسار امت کے لئے حضورؐ کے روبرو حاضر ہونے کا سہارا تلاش کر لیا۔ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس ہوئی تو اس میں جو کچھ وہاں کے مسلمانوں پر گزری اس نے عالمِ اسلام میں حشر برپا کر دیا۔ ان شہداء کی یاد میں شاہی مسجد (لاہور) میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ نے اپنی وہ رقت انگیز نظم پڑھی جس نے مجمع کو تڑپا کر رکھ دیا، اور جس سے آج بھی ہر قلبِ حساس خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی پُر کیف منظر کشی کی ہے کہ کس طرح وہ عالمِ بالا کی سیر کے لئے گئے اور کس طرح

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

حضورؐ نے فرمایا کہ تم عالمِ ارضی سے آئے ہو تو ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ اس پر اقبالؒ نے عرض کیا کہ حضورؐ! دنیا کی حالت ایسی ابتر ہو چکی ہے کہ مجھے کوئی شے ایسی ملی نہیں جو حضورؐ کے شایانِ شان ہوتی اور میں اسے بطور تحفہ ساتھ لاتا۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں   جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

---

[1] نوادرات - علامہ اسلم جیراج پوریؒ

[2] صادق جس نے سلطان ٹیپوؒ کے خلاف سازش کی تھی اور جعفرِ بنگال جس نے سراج الدولہ کے ساتھ غداری کی تھی - علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ان کے متعلق ایک عبرت آموز نظم لکھی ہے۔

اس آبگینہ میں کیا ہے ؟

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

لاریب جنابِ رسالتمآبؐ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی نذرانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اور ہماری صد ہزار خوشی بختی ہے کہ اسی قسم کا ایک سہارا ہمیں بھی میسّر آگیا ہے۔ اور ہم بھی حضورؐ کو منہ دکھلانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جب ہم حضورِ رسالتمآبؐ میں حاضر ہونگے تو عرض کریں گے کہ ہم بھی حضورؐ کے لئے نذر کو اک آبگینہ لائے ہیں۔ اس آبگینہ میں کیا ہے ؟

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
تپاں ہے راشد منہاس کا لہو اس میں

اپنے مقدس لہو کی قیمت ادا کرکے ہماری آبرو رکھنے والے' راشد شہید! تم پر لاکھ لاکھ سلام

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؕ

والسلام

کتاب التقدیر

تقدیر کا مسئلہ' دنیا کا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ جس سے اس قسم کے سوالات ابھرتے ہیں کہ :-

(۱) کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوئی تھی ؟　(۲) کیا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟
(۳) کیا رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہ جسے چاہے امیر بنا دے اور جسے چاہے کنگال کر دے ؟
(۴) کیا مصیبتیں سب خدا کے حکم سے آتی ہیں ؟　(۵) کیا عزت اور ذلت خدا کی طرف سے ملتی ہے۔
(۶) کیا یہ ٹھیک ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے' یا انسان کی عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے ؟
(۷) بعض بچے پیدائشی اندھے، اپاہج، لولے، لنگڑے ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟
(۸) کیا دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے ؟ اگر نہیں بدل سکتی تو پھر دعا کیوں مانگی جاتی ہے ؟

یہ' اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا نہایت اطمینان بخش جواب' قرآن مجید کی روشنی میں ۔۔۔ پرویز صاحب نے تقدیر کے مسئلہ کو جس نے ہزارہا سال سے انسانی ذہن کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے، اس خوبصورتی سے حل کرکے رکھ دیا ہے کہ زبان پر بے اختیار تحسین و تبریک کے الفاظ آجاتے ہیں۔ ضخامت چار سو صفحات سے زاید۔ عمدہ سفید کاغذ، مضبوط جلد، دیدہ زیب گرد پوش'

قیمت : پندرہ (۱۵) روپے (علاوہ محصول ڈاک)

امید ہے کہ کتاب' فرمائشوں کی ترتیب کے مطابق' وسط اکتوبر سے بھیجی جانی شروع کر دی جائے گی۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

حقائق و عبر

۱۔ خدا کیلئے مظلوم اسلام پر رحم کیجئے

ریڈیو اور ٹیلیویژن (بالخصوص ٹیلی ویژن) دورِ حاضر کے مفید ترین آلۂ ابلاغ ہیں۔ زندہ قومیں اِن سے تعمیرِ قوم اور سیرت سازی کے کام لیتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں پہنچ کر یہی تریاق خود زہر بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم وہاں سے ان مشینوں کو تو درآمد کر لیتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے، ان سے کام لینے والے بہرحال اسی قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ہمیں ان کی اصلاح کے سلسلے میں، اکثر مراسلات موصول ہوتے رہتے ہیں لیکن ہم نے ان کے متعلق کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے، ان اداروں کی حیثیت اُس ادارہ سے مختلف نہیں جس کے متعلق اقبالؒ نے کبھی کہا تھا کہ

> من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
> بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

ان کے پاس ایک خاص بجٹ ہوتا ہے جسے انہوں نے اپنے مخصوص حلقے میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ ان کے خلاف اگر کوئی شکایت ابھرتی ہے تو اس وقت جب ان کے ٹولے میں سے کسی کو مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں کوئی "ناانصافی" نظر آتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کے ہاں سب خیریت ہوتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود بعض مقامات ایسے بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں ہم سمجھتے ہیں کہ —— اگر خاموش بنشینم گناہ است —— اسی قسم کا ایک حادثہ ہے جس نے ہمیں ان سطور کی تسوید پر مجبور کیا ہے اور وہ حادثہ یہ ہے کہ اب ان کوتاہ آستینوں کی دراز دستیاں اسلام کے حلقوم تک بھی پہنچ رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر اب پروگراموں کا ایک سلسلہ اسلام سے متعلق نشر کیا جاتا ہے۔ اسلام سے متعلق جو کچھ محراب و منبر سے نشر ہوتا ہے وہی اس کی خانہ ویرانی کے لئے کم نہیں ہوتا، لیکن یہ پروگرام اب اُس سے کہیں زیادہ زہر افشانی کر رہے ہیں۔ قوم کا نوجوان طبقہ ان پروگراموں کی طرف اس لئے لپک کر آتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے ملا گزیدہ اسلام پیش نہیں کیا جائے گا۔ یہاں علم و بصیرت کی بات سننے میں آئے گی لیکن جب وہ اس اسلام کو دیکھتا ہے جو اس گوشے سے پیش کیا جاتا ہے تو پھر اسلام کے خلاف اس کی نفرت سرکشی میں بدل جاتی ہے۔ ہم مثال کے طور پر ٹیلیویژن کے صرف ایک پروگرام کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ پروگرام (آدابِ خود آگاہی) کے عنوان سے حال ہی میں نشر ہوا تھا اور موضوع گفتگو تھا —— اسلام اور عقل —— مستفسر یا بالفاظِ صحیح معترض (غالباً) کالج کے طلباء تھے۔ ان میں سے ایک نے یہ اعتراض کیا کہ اسلام ہمیں اس قدر توہم پرستانہ تعلیم دیتا ہے کہ علم و بصیرت اسے کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتی۔ مثلاً آج سائنس اپنی تحقیقات اور انکشافات سے اس حقیقت تک پہنچ چکی ہے کہ یہ کائنات یک لخت اسی طرح وجود میں نہیں آگئی تھی بلکہ یہ بڑے بڑے طویل المیعاد مراحل میں سے گزرتی ہوئی، پہلو بدلتی ہوئی، رفتہ رفتہ،

بتدریج اس حقیقت تک پہنچی ہے۔ اور قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو "چھ دنوں" میں پیدا کیا۔ اب فرمائیے کہ قرآن کے اس بیان کو علم و بصیرت کی رُو سے قابلِ تسلیم قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس اعتراض کے جواب میں "بزرگوار" نے (یاد رہے کہ یہ صاحب ماڈرن قسم کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے) جنہیں اسلام مظلوم کی وکالت کے لئے منتخب کیا گیا تھا، اس قسم کی بھانت بھانت کی بولیاں بولیں کہ معترضین استہزا آمیز ہنسی ہی نہیں ہنس رہے تھے، بلکہ ان کی ہر حرکت ان کی قلبی کیفیت کی غماز تھی اور ہماری حالت یہ کہ جی چاہتا تھا کہ ٹیلیویژن سیٹ توڑ کر رکھ دیا جائے حالانکہ اس اعتراض کے جواب میں کہنے کی بات فقط اتنی تھی کہ عربی زبان میں یوم کا لفظ چوبیس گھنٹے پر مشتمل دن رات پر ہی نہیں بولا جاتا بلکہ اس سے مراد ایک عہد، ایک زمانہ، ایک طویل المیعاد وقفہ، ایک مرحلہ، تاریخ کا ایک طویل باب بھی ہوتا ہے اور قرآن کریم نے خود اس کی صراحت کر دی ہے کہ خدا کا ایک ایک دن (یوم) ہمارے حساب و شمار سے پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اس نے کہا ہے کہ خدا نے ارض و سما کو "چھ یوم" میں پیدا کیا ہے، تو اس سے مراد نہایت طویل المیعاد مراحل ہیں۔ انہیں یہ بتایا جاتا، اور اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات پیش کر دی جاتیں جہاں اس نے نہایت وضاحت سے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے اور جن کی تائید سائنس کے انکشافات اور محققین کی تحقیقات سے چلی جا رہی ہے۔ لیکن نہ ٹیلی ویژن والوں کو اس سے کوئی غرض تھی کہ اس پروگرام کے ذریعے کوئی قرآنی حقیقت پیش کی جاتی، نہ اسلام بیچارے کے ان وکیل صاحب نے یہ اپنا فریضہ سمجھا تھا کہ وہ معترضین کو اس کی پیش کردہ صداقتوں کا قائل کر دیتے۔ ٹیلی ویژن والے اپنی رپورٹ میں فخریہ لکھ دیں گے کہ ہم نے اتنے پروگرام اسلام کے متعلق پیش کر دیئے۔ باقی رہے وکیل صاحب، تو ان کا کام اپنا محنتانہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ مقدمے میں کامیابی یا ناکامی قسمت کی رُو سے ہوتی ہے۔

اگر ہماری یہ آواز کہیں سنائی دے سکتی ہے تو ہم اربابِ نظم و نسق کی خدمت میں بادب گزارش کریں گے کہ خدا کے لئے مظلوم اسلام کی حالت پر رحم فرمائیے۔ قوم کے نوجوانوں کو اس سے متنفر اور سرکش بنانے کے لئے ملک میں ایسے عناصر کی کچھ کمی نہیں جو ان میں آپ کے اضافے کی بھی ضرورت ہو۔ شاید وہ یہی دن تھے جن کے پیشِ نظر قرآن بھیجنے والے نے کہا تھا کہ میری آیات کو اتنے سستے داموں نہ بیچو۔

—— (٠) ——

۲۔ ان کا شمار کن میں ہوگا؟

نوائے وقت مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۷۱ء میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق مولوی فرید احمد نائب صدر پاکستان جمہوری پارٹی مشرقی پاکستان نے راولپنڈی میں مقامی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

شیخ مجیب، تاج الدین اور قمر الزمان کو ۱۹۵۸ء میں غیر ملکوں نے اپنا ایجنٹ مقرر کیا کہ وہ نظریہ پاکستان کو ناکام بنا دیں۔ (بحوالہ ماہنامہ فیض الاسلام بابت جولائی و اگست ۱۹۷۱ء۔ صفحہ ۹)

۲۔ خان عبد القیوم خان صاحب نے حال ہی میں دو انکشافات فرمائے ہیں۔ ایک میں انہوں نے کہا ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ مجیب نے منعم خان کو ۱۹۶۵ء میں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ آزادی کا اعلان کر دیں۔

(بحوالہ۔ دی نیو ٹائمز راولپنڈی مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۷۱ء)

اسی اخبار کی ۱۳ اگست کی اشاعت میں یہ مذکور ہے کہ قیوم خان صاحب نے پشاور میں روٹری کلب کے ایک عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ سال گزشتہ جب ڈھاکہ میں لینن کی برسی کی تقریب منائی جا رہی تھی تو روس کے سفیر متعینہ پاکستان تقریب میں آئے اور انہوں نے شیخ مجیب کو (YOUR EXCELLENCY) کہہ کر مخاطب کیا اور اُن سے کہا ہم آپ کی تمام ضروریات پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب مولوی فرید احمد صاحب کو ۱۹۴۹ء سے معلوم تھا کہ مجیب الرحمٰن نظریہ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے دشمن ممالک کا آلہ کار ہے تو وہ اس تئیس چوبیس برس تک منہ میں گھنگنیاں ڈالے کیوں بیٹھے رہے۔

اور ہم قیوم خان صاحب سے پوچھتے ہیں کہ جب انہیں اس کا علم تھا کہ مجیب صاحب نے ۱۹۶۵ء میں مشرقی پاکستان کی آزادی کا مشورہ دیا تھا۔ اور پھر پچھلے سال انہیں اس کا بھی علم ہو گیا کہ روس مجیب کیساتھ کیا ساز باز کر رہا ہے تو جناب خان صاحب گونگے کا گڑ کیوں کھاتے بیٹھے رہے۔ کیا یہ ایسے امور نہیں تھے کہ انہیں ذمہ داران حکومت تک بھی پہنچایا جاتا اور قوم کے سامنے بھی بے نقاب کیا جاتا۔ ہمارے نزدیک (اور ملک کے عام قانون کے مطابق بھی) کسی جرم کا چھپانا خود ایک سنگین جرم ہوتا ہے اور جب وہ جرم بھی غداری کی نوعیت کا ہو تو اُسے چھپانا جس قدر سنگین جرم ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ آج یہ اور اسی قسم کے کئی دیگر حضرات دندناتے پھر رہے ہیں لیکن غالب بہت پہلے کہہ گیا تھا۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

——— (۱) ———

۲۔ معرکۂ دین و وطن

طلوعِ اسلام گزشتہ چوبیس سال سے اس بات کو برابر دہراتے چلا آرہا ہے کہ جب تک ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کے دل میں اس حقیقت کو راسخ نہیں کر دیں گے کہ سرزمین پاکستان عام وطنوں کی طرح ایک وطن ہے اور نہ یہاں کی مملکت عام مملکتوں کی سی ایک مملکت ۔۔ اُس وقت تک یہاں کے ملی مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل سکے گا۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب کا وہ مقالہ جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت ستمبر میں شائع ہوا تھا اور اُن کا وہ خطاب جو زیرِ نظر اشاعت میں شائع ہو رہا ہے خاص طور پر درخورِ توجہ ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں تأسف ہوا کہ ۶ ستمبر کے یوم دفاع کے سلسلے میں اکابرینِ ملت کی طرف سے جس قدر پیغامات، اعلانات، بیانات، خطابات، تقاریر وغیرہ فضا میں پھیلیں اُن سب میں ان شہدا کو وطن کی حفاظت میں جان دینے والے کہہ کر پکارا گیا، کوئی بھی اس سے آگے نہ بڑھا۔ کسی نے بھی انہیں اسلام کا محافظ اور دین کا پاسبان کہہ کر نہ پکارا۔ اس سلسلے میں ایک بیان مفتی محمود صاحب کا بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ بزرگوار اپنے آپ کو بہت بڑا عالم اور اسلام کا بہت بڑا محافظ قرار دیتے ہیں۔ سنیئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں کہا۔

> شہدائے ستمبر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس مادرِ وطن کی ناموس کی خاطر ملک کے ان جانبازوں نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کی تھی، ہم اُس ناموس پر کوئی حرف نہ آنے دیں۔

(امروز ۔ بابت ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۲)

آپ "مادرِ وطن" کی اصطلاح پر غور فرمائیے یہ خالص مشرکانہ تصور ہے۔ ہندوؤں کے ہاں گؤ ماتا، گنگا ماتا، بھارت ماتا، دھرتی ماتا

—— اُن کے معبودانِ باطل کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ تصور زمانۂ قدیم کے اصنامیات کا پیدا کردہ ہے جس کی جڑ کاٹنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ قرآن نے وطن کو صرف اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ قرآنی قوانین و احکام کی تنفیذ کا محسوس ذریعہ بنتا ہے اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ جس وطن میں اس کا امکان نظر نہ آتا ہو وہاں سے ہجرت کر جانا مومن کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا تھا اور قرآن نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جن مسلمانوں نے بلا کسی عذر کے مکہ سے ہجرت نہیں کی، اُن کے ساتھ جماعتِ مومنین کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسلام میں جس وطن کی یہ حیثیت ہو اُسے مادرِ وطن کہنا بت پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مفتی محمود صاحب کے تحت الشعور میں ایک اور بھی چور پہلو بدل رہا ہے۔ اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو وہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں اور مولانا مدنی کے خلاف علامہ اقبالؒ نے اپنے بسترِ مرگ سے جو جنگ لڑی تھی اس کی بنیاد مولانا صاحب کا یہی غیر اسلامی تصور تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس بحث و نزاع کا نام ہی "معرکۂ دین و وطن" قرار دیا تھا۔ ان حضرات کے دل میں اُسی تحاؤسا لسامری کی محبت ہے جو اس قسم کی اصطلاحات کے پردے میں فضا میں منتشر ہو جاتی ہے۔

ہم مفتی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و حدیث یا صدرِ اول کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے ملک کو مادرِ وطن کہا گیا ہے؟

—— (○) ——

۴۔ سفید ہاتھیوں کے کارنامے

اس شاہانہ ٹھاٹھ رکھنے والی بھوکی قوم کے اصطبل میں جو سفید ہاتھی بندھے ..... ہیں اُن میں اسلامی مشاورتی کونسل اور اُس کا ذیلی ادارہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ خاصے تومند توانا ہیں۔ چنانچہ کچھ سال اُدھر اخبارات میں شائع شدہ اعداد و شمار کی رُو سے یہ حقیقت منکشف ہوئی تھی کہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا سالانہ بجٹ قریب بارہ لاکھ روپے ہے۔ اُس میں ریسرچ کس انداز کی ہوتی ہے، اس کے کچھ نوادرات انسٹیٹیوٹ کے ترجمان ماہنامہ "فکر و نظر" میں وجہ تابانی فکر و نظر ہوتے رہتے ہیں مثلاً اس رسالہ کی ستمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے —— دعا، اہمیت و ضرورت —— دعا کی اہمیت عنوان سے ظاہر ہے لیکن اس میں کہا کیا گیا ہے، اُسے ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ فرمایئے۔

"دعا بارگاہِ الٰہی میں کیسے اور کس حالت میں فوراً قبول ہوتی ہے؟ اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ کتاب المجابین میں ابن ابی الدنیا نے حسن بصری سے بسلسلہ دعا یہ قصہ بیان کیا ہے۔

انصار صحابہ میں ابو مغلق نامی ایک صحابی تھے جو بہت بڑے تاجر تھے۔ اپنا اور دوسروں کا مالِ تجارت لیکر دور دور تک تجارت کے لئے جاتے تھے۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ ایک مرتبہ سفر میں آپ کو ایک ڈاکو نے گھیر لیا۔ ڈاکو نے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے رکھ دو، میں تمہیں قتل کرتا ہوں۔ آپ نے کہا، اگر مال درکار ہے تو اسے لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ ڈاکو نے کہا کہ مال تو اب میرا ہے ہی، میں تمہیں قتل بھی کروں گا۔ آپ نے کہا، اچھا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں چار رکعت نماز پڑھ لوں۔ ڈاکو نے کہا۔ اچھا اجازت ہے۔ چنانچہ آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی اور آخری سجدے میں یہ دعا پڑھی۔

یا ودود یا ذا العرش المجید، یا فعال لما یرید اسئلک بعزتک الذی لا یرام و بملکک

الذی لایضام وبنورک الذی ملأ ارکان عرشک ان تکفینی شر ھذا اللص یا مغیث اغثنی، یا مغیث اغثنی، یا مغیث اغثنی۔

اے محبت کرنے والے، اے شاندار عرش کے مالک، اے اپنے ارادے سے سب کچھ کرنے والے، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری عزت کا واسطہ دیکر جسے کوئی چھیڑ نہیں سکتا، تیری مالکیت کا واسطہ دے کر جس میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا، اور تیرے نور کا واسطہ دے کر جس سے تیرے عرش کے چاروں کونے منور ہیں، اس ڈاکو کے شر سے تو مجھے بچالے۔ اے فریاد رس میری مدد کر، اے فریاد رس میری مدد کر! اے فریاد رس میری مدد کر۔

کہتے ہیں، تین مرتبہ آپ نے یہ دعا پڑھی، اسی وقت غیب سے ایک سوار ہاتھ میں نیزہ لئے نمودار ہوا، اور ڈاکو کو فوراً نیزے میں پرو لیا۔ اور ابو مغلق انصاری کو آواز دی۔ اور کہا۔ اے ابو مغلق اٹھو اور سجدے سے سر اٹھاؤ۔

ابو مغلق انصاری نے سجدے سے سر اٹھا کر سوار کو دیکھا۔ دریافت کیا تم کون ہو، جس کے ذریعے مجھے آج نجات ملی ہے۔ سوار نے جواب دیا۔ میں چوتھے آسمان کا ایک فرشتہ ہوں۔ جب وقت تم نے دعا کی تو اس دعا نے آسمان کے دروازے ہلا دیئے۔ جب تم نے دوسری مرتبہ یہ دعا کی تو آسمان والوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جب تم نے تیسری مرتبہ دعا کی تو مجھے حکم ہوا کہ یہ ایک ستم رسیدہ آدمی کی دعا ہے اور میں فوراً تمہاری مدد کو آ پہنچا۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی باوضو ہو کر چار رکعت نماز پڑھے اور مذکورہ دعا مانگے اسکی دعا ضرور قبول ہوگی، خواہ وہ ستم رسیدہ ہو یا نہ۔"

یہ ہے اسلام کی وہ تحقیق جس میں یہ ادارہ برسہا برس سے مصروف ہے۔ کیا قوم کو ان حضرات کا شکرگزار ہونا چاہیئے یا نہیں؟

(٥)

۵۔ فساد کی چنگاری

دنیا میں مختلف فتنے اٹھتے رہتے ہیں۔ لیکن جو فتنہ مذہب کے نام پر اٹھایا جاتا ہے اس سے زیادہ مہلک کوئی اور فتنہ نہیں ہوتا اور اس حقیقت کی زندہ مثال خود پاکستان کی چوبیس سالہ تاریخ ہے۔ مملکتِ پاکستان کا بنیادی مسئلہ دستور سازی کا ہے۔ اور چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے اس کے دستور کا اسلامی ہونا خود اس مملکت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے اور یہی وہ بنیادی تقاضا ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ہماری مذہب پرست .... جماعتیں اس کوشش میں لگی رہی ہیں کہ یہاں کوئی آئین بننے ہی نہ پائے۔ آئین سازی کے سلسلے میں اب آخری کوشش صدرِ مملکت یحییٰ خان نے شروع کی ہے۔ جماعتِ اسلامی نے پیش بندی کے طور پر ابھی سے اپنی وہی دیرینہ کاوش شروع کر دی ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ یہاں کوئی قابلِ عمل دستور یا ضابطہ قوانین بن نہ سکے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ مودودی صاحب نے پچھلے سال واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

> کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین بن نہیں سکتا جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان متفق علیہ ہو۔

تفصیل کے لئے قارئین کی توجہ اُس مبسوط مقالہ کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے جو طلوعِ اسلام کی اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا" اسلامی مملکت کا خواب جو کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو گیا۔" یہ بحث شیعہ حضرات کے ساتھ چلی

تھی۔ اور مودودی صاحب نے اُن سے کہا تھا کہ انہیں کتاب و سنت کی اُس تعبیر کو لامحالہ ماننا پڑیگا جو یہاں کی اکثریت (یعنی حنفیوں) کے نزدیک مسلم ہو۔ اور شیعہ حضرات کیطرف سے مودودی صاحب کی اس تعبیر کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔

اب جو نیا دستور زیرِ تدوین ہے تو جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ راگست ۱۹۷۱ء میں یہ ریزولیوشن پاس کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> پاکستان میں قرآن و سنت کو ماخذِ قانون کی حیثیت حاصل ہوگی اور کوئی قانون انکے منافی نہ بنایا جاسکیگا اور اگر کوئی ایسا قانون بنایا جائے تو اُسے عدالت میں چیلنج کیا جاسکیگا، نیز ایسے تمام قوانین جو پہلے سے چلے آتے ہیں اور قرآن و سنت کے احکام اور اصولوں سے متصادم ہیں ایک مقررہ مدت کے اندر بدل کر قرآن و سنت کے مطابق بنا دیئے جائینگے۔
>
> (ایشیا۔ مورخہ ۲۹ راگست ۱۹۷۱ء)

یعنی ایک طرف مودودی صاحب خود ہی فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو اور دوسری طرف صدرِ مملکت سے کہا جارہا ہے کہ وہ اپنے مجوزہ قانون میں یہ شق رکھ دیں کہ ملک کا قانون کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔

آپ نے غور فرمایا کہ کس قدر معصوم اور مقدس طریقے سے مجوزہ دستور کی تعمیر میں خرابی کی صورت رکھ دینے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔

(۱)

۲۔ دو قومی نظریہ کا فریب

پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے اور دو قومی نظریہ سے مراد یہ ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہوسکتے۔ پاکستان میں اس نظریہ کو اب تک عملاً مسترد قرار دیا جاتا رہا ہے کیونکہ یہاں نیشن سے مراد صرف مسلمان ہی نہیں لئے جاتے بلکہ مسلمان اور غیر مسلم مشترکہ طور پر اس نیشن کے افراد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

یہاں ایک گروہ نے جنم لیا ہے جو اپنے آپ کو اسلام پسند کہتا ہے (یعنی انہوں نے اسلام کو اختیار نہیں کیا بلکہ وہ اُسے فقط پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں) لیکن وہ اپنے آپکو اسلام اور نظریہ پاکستان یعنی دو قومی نظریہ کا اجارہ دار بھی قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ یہاں کے انتخابات غیر مخلوط (جداگانہ) ہونے چاہئیں کیونکہ (اُن کے قول کے مطابق) یہی دو قومی نظریہ کا تقاضا ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ دو قومی نظریہ کا یہ تقاضا ضرور ہے۔ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کو اپنا نمائندہ تجویز نہیں کرسکتا۔ لیکن دو قومی نظریہ کی حد وہیں تو ختم نہیں ہوجاتی۔ دو قومی نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو آپ یہاں 'نیشن یا نیشنل' سے تعبیر کریں کوئی غیر مسلم اسمیں شرکت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ پاکستانی (یعنی اسلامی) قوم کا فرد نہیں۔ اسکا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم نہ آئینی مجلس آئین ساز کا ممبر ہوسکتا ہے نہ مجلسِ قوانین ساز کا رُکن۔ نہ ہی وہ اس مملکت میں شریکِ حکم ہوسکتا ہے کیونکہ اسمیں حکومت سے مراد ہی قوانین خداوندی کا اجراء ہوتا ہے لیکن یہ حضرات غیر مسلموں کو اس کا پورا پورا حق دیتے ہیں کہ وہ ان مجالس کے رکن بھی ہوسکتے ہیں اور مملکت میں شریکِ حکم بھی۔ بشرطیکہ ان کا انتخاب جداگانہ ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنا بڑا دھوکہ ہے جو لوگوں کو اس باب میں دیا جاتا ہے اور یہ دھوکہ دیا اسلئے جاتا ہے کہ ان لوگوں کو غیر مسلموں کے ووٹ ملنے کی توقع نہیں۔ کیسا عبرت انگیز ہے یہ دور بھی کہ جس میں جسے دیکھو "نیزے پر قرآن لٹکائے" چلا آرہا ہے ۔۔۔ !!

شاہد عادل

تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت

تمباکو نوشی کے مضر اثرات کی بابت کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ خود مغربی ممالک جنہوں نے یہ تحفہ دنیا کو دیا تھا، اس کے نتائج بد سے چیخ اٹھے ہیں۔ ان کی تحقیقات کے مطابق تمباکو اپنے نشہ آور اجزاء کی بناء پر انسانی صحت کے لئے شراب نوشی سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اب یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر ہی اسے حل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے امریکہ میں علمی تحقیقات کی رو سے اس کے مضر اثرات کا انکشاف ہوا۔ وہاں کی حکومت کے لئے اسے یکدم ختم کرنا تو ممکن نہیں تھا، اس لئے اس مقصد کے حصول کے لئے تدریجی طریق کار اختیار کیا گیا۔ اس کے مضر اثرات کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی، اور ساتھ ہی سگریٹ ساز فیکٹریوں کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ اس کے ہر پیکٹ پر اس کے مضر صحت ہونے کی تحریری تصریح کریں۔ وہاں کے سنجیدہ اخبارات و رسائل نے بھی قوم کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے بھرپور تعاون کیا، یہاں تک کہ انہوں نے مالی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا، مثلاً تمباکو نوشی سے متعلق اشتہارات قبول نہ کرنے سے انہیں کروڑوں روپیہ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں کے صرف ایک ماہنامے ریڈرز ڈائجسٹ کو سالانہ چالیس لاکھ روپے کی آمدنی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کوششوں کے امریکی عوام پر مثبت نتائج مرتب ہوئے، خیال رہے کہ وہاں یہ سب کچھ شرعی احکامات کی تعمیل میں نہیں، بلکہ محض جذبہ حب الوطنی کے تحت اپنے ہم قوموں کی صحت کو مضر اثرات سے بچانے کے لئے کیا گیا۔

ہمارے ملک میں تمباکو نوشی — اس کے برعکس دوسرے ممالک بشمول پاکستان میں تمباکو نوشی دن بدن ترقی پذیر ہے۔ اس کا اندازہ کچھ ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں سگریٹ کی پیداوار

۱۹۵۰–۵۱ء	=	۲ ارب سگریٹ
۱۹۶۰–۶۱ء	=	۱۰ ارب ۸۸ کروڑ سگریٹ
۱۹۶۶–۶۷ء	=	چھبیس ارب سگریٹ

نوٹ:۔ ۱۹۵۹ء میں صرف بیڑی بنانے والا تمباکو ساڑھے لاکھ روپے کی مالیت کا درآمد کیا گیا تھا۔

(بحوالہ کتاب معاشیات۔ از شیخ منظور علی۔ مطبوعہ علمی کتاب خانہ لاہور)

یہ اعداد و شمار پانچ سال پرانے ہیں اور ان کی نسبت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب سگریٹ کی پیداوار کونسی حدود کو چھو رہی ہوگی، ان سگریٹوں کی قیمت تقریباً دو ارب روپے بنتی ہے۔ اور تمباکو کی دوسری اقسام مثلاً پان بیڑی، حقہ کا تمباکو، بیڑا وغیرہ جن کی کھپت سگریٹوں سے کئی گنا زیادہ ہے، اس کے علاوہ ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہماری قوم صرف تمباکو نوشی پر ملکی دفاع کے اخراجات سے دو تین گنا زیادہ خرچ کر رہی ہے۔

یہ تو صرف مالی نقصان کی جھلک ہے صحت پر اس کے جو مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کا ہمارے ملک میں جہاں متوازن غذا کی پہلے ہی کمی ہے، اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی حالت دوسرے ترقی پذیر ممالک کی ہے جس سے مجبور ہو کر ادارۂ اقوام متحدہ اسے بین الاقوامی طور پر حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے رواج کو کم کرنے کیلئے اس بین الاقوامی ادارے نے مختلف ممالک کو دو تین ماہ پہلے کچھ ہدایات جاری کیں جن پر فوری طور پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں اس پر ٹیکس کی شرح میں اضافے کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس کی تشہیر کی ممانعت کردی گئی ہے[1]۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک عامۃ الناس میں اس کے مضر اثرات کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا۔

تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت

مغربی علمی تحقیقات کے حوالے سے ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ مجموعی لحاظ سے تمباکو نوشی کے اثرات شراب نوشی سے زیادہ مضرت رساں ہیں۔ اب شراب کی حرمت کے بارے میں تو اسلامی تعلیمات میں واضح احکامات موجود ہیں۔ لیکن تمباکو چونکہ تہذیب جدید کا تحفہ ہے۔ اس لئے اس کے نام کی صراحت کے ساتھ ہمارے اسلاف سے کچھ منقول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ نشہ آور چیزوں کے بارے میں یہ اصولی حکم موجود ہے کہ کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ ۔ یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ چنانچہ جونہی تمباکو نوشی کا رواج شروع ہونے لگا۔ علمائے اسلام نے اس کی نشہ آور حیثیت کو سامنے رکھ کر اس کی حرمت کا فتویٰ دے دیا۔ قارئین میں سے، جن کی تاریخ جدید پر نظر ہے، کو معلوم ہوگا کہ ایران میں صرف اس فتویٰ کی وجہ سے ایک بہت بڑی شورش برپا ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں برصغیر کے عظیم فقیہہ و مفتی علامہ عبدالحی فرنگی محلی تھے، اور یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا۔ کہ ابھی تک برصغیر پاک و ہند نے ان جیسا فقیہہ پیدا نہیں کیا۔ فقہ میں اس مرتبہ بلند کے باوجود ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا۔ کہ جب تک اپنے زمانے کے اجلّ فقہاء کو فتویٰ دکھا نہ لیتے جاری نہ کرتے، چنانچہ ان کے اکثر فتاویٰ پر ان فقہاء کی مہریں ثبت ہوتیں، آپ نے تمباکو اور سگریٹ کے نشہ آور پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے یعنی جمادی الثانی سنہ ۱۲۹۸ھ میں اپنا یہ تاریخی فتویٰ صادر فرمایا:۔

"چرٹ پینا مثل حقہ پینے کے مکروہ تحریمی ہے۔ بلا ریب و بلا شک۔ اور چرٹ پینے میں بسبب مشابہت نصاریٰ کے زیادہ کراہت ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہٗ الراجی عفو ربہ القوی ابوالحسنات محمد عبدالحی تجاوز اللہ عنہٗ ذنبہ الجلی والخفی۔

(مجموعۃ الفتاویٰ مطبوعہ مطبع شوکت اسلام لکھنؤ ۱۳۰۹ھ جلد اول صفحہ ۸۳)

---

[1] ٹیلی ویژن پر تو ابھی تک سگریٹوں کے اشتہارات آرہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

مقام افسوس ہے کہ پچھلے کافی عرصے سے اس فتویٰ کو عامۃ الناس کے سامنے نہیں لایا گیا بعض علماء سے اس غفلت کے بارے میں گفتگو کرنے پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ اس وقت خود ہمارے اکثر معزز علمائے کرام کسی نہ کسی شکل میں تمباکو نوشی مثلاً پان، حقہ، بیڑا وغیرہ کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ایسے شرعی احکام کو سامنے لانا ممکن نہیں رہا ہے۔

فتویٰ کی سنگینی

فقیہہ ہند علامہ عبدالحی صاحب کے فتویٰ کی عبارت اصطلاحی ہے، جس کی وجہ سے شاید عام قارئین کو اس کی سنگینی کا علم نہ ہو سکے۔ تمباکو نوشی کی حرمت کا شرعی حکم انہوں نے "مکروہ تحریمی" بیان فرمایا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس اصطلاح کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:-

"مکروہ تحریمی یہ ہے کہ جو حرام سے زیادہ قریب ہو۔ اور وہ واجب اور سنت موکدہ کے مقابل ہو"

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۱ صفحہ ۶۱۵)

یعنی ایک مسلمان سگریٹ یا تمباکو نوشی سے اتنا ہی گناہگار ہوگا۔ جتنا وہ کسی واجب شرعی حکم کے ترک کرنے سے ہوگا۔ اسے عملی مثال سے یوں سمجھئے:-

احناف کے نزدیک اضحیہ یعنی قربانی کا شرعی حکم وجوب کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک شخص سگریٹ پینے سے اتنا ہی گناہگار ہوگا۔ جتنا وہ مالی استطاعت کے باوجود جان بوجھ کر قربانی ترک کر دینے سے ہوگا۔

حرفِ آخر

یہ ہے تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کی شرعی حرمت کی اس سنگینی کے باوجود عامۃ الناس تو کجا اہل علم تک ناواقف ہیں۔ اوپر ہم نے قربانی کا حنفی مسلک پیش کیا ہے۔ دوسرے ائمہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک قربانی کا شرعی حکم یہ ہے یثاب فاعلها و لا یعاقب تارکها (قربانی کرنے والا ثواب کا مستحق ہے اور تارک کی کوئی پکڑ نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۱ صفحہ ۵۹۳)

ہمارے ہاں اگر کوئی صاحب قربانی کے حنفی مسلک کے مقابل میں ان ائمہ کا مسلک پیش کر دیں تو علماء حضرات اس کے ایمان کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اسی جیسے سنگین گناہ یعنی سگریٹ اور تمباکو نوشی کا کھلے بندوں ارتکاب ہو رہا ہے اور ان حضرات کی زبان مبارک سے ایک لفظ تک نہیں نکلتا[1]

اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں قومی مسائل کو سیاسی نقطہ نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے مثلاً خاندانی منصوبہ بندی جس کے جواز کے واضح شرعی احکامات موجود ہیں کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے ان حضرات نے لاکھوں کتابچے اور پمفلٹ تقسیم کئے گئے[2] لیکن تمباکو نوشی جیسی نشہ آور اور مضرت رساں چیز کے بارے میں ان کے الماریاں بھر دینے والے لٹریچر میں ایک لفظ تک نہیں ملتا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات نے صرف خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت میں جتنا زور اور وسائل صرف کئے ہیں۔ اس کا عشر عشیر تمباکو نوشی، شراب، زنا، سود وغیرہ کی حرمت اور ممانعت کے بارے میں استعمال کرتے تو آج ہمارا معاشرہ بہت سی برائیوں سے پاک ہو چکا ہوتا۔

---

[1] کیونکہ تمباکو کو جیسے پان نے ان کا منہ بند کر رکھا ہوتا ہے۔ (طلوع اسلام) [2] اس طرح عائلی قوانین کے خلاف۔ (طلوع اسلام)

محمد ارشاد احمد
ناظم بزم طلوع اسلام کراچی

ہمارا محبوب نظریہ

بنی اسرائیل نے جب درخواست کی کہ ان کا کوئی کمانڈر مقرر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے حضرت طالوتؑ کو منتخب فرمایا۔ قوم نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس کے پاس دولت کے خزانے نہیں اس لئے اسے امارت کے لئے کس طرح منتخب کیا گیا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ امارت کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہے وہ اس میں موجود ہیں اس لئے وہی اس منصب جلیلہ کے لئے موزوں ترین شخصیت ہے۔ وہ خصوصیات کیا تھیں، ارشاد ہے " وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷)" اور اللہ نے اسے علمی اور جسمانی قوتوں میں بہت فراخی عطا فرمائی ہے۔ غور فرمائیے کہ ان دو الفاظ (علم و جسم) کے اندر قرآن کریم نے کس طرح انفس و آفاق کی خصوصیات سمیٹ کر رکھ دی ہیں، علمی فوقیت اور جسمانی قوت یہی ہیں، وہ دو پہیے جن پر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی پوری گاڑی رواں دواں جانب منزل جاری ہے، یہی ہیں وہ دو بازو جن پر قوموں کے شاہین اوج اقبال کی فضاؤں میں کہکشاں گیر شہپر ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی کمزور ہو جائے تو قوم زمین سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ علم سے مفہوم وہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے انسانی فکر ترتیب پاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب انسانی فکر فطرت کے اصولوں کے مطابق رہ کتا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ شرف انسانیت کا ارتقاء و عروج ہوتا ہے۔

جہاں تک جسمانی تربیت کا تعلق ہے یہ انسان کا جبلّی تقاضا ہے کہ وہ اولاد کی جسمانی نشو و نما کی فکر کرتا ہے۔ مگر ماں باپ کا انتہائی فریضہ نہیں کہ وہ انہیں جسمانی طور پر پال پوس کر جوان کر دیں۔ یہ کام تو حیوانات بھی کر دیتے ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں انسان بنائے۔ اس کی اخلاقی اور نظریاتی اعتبار سے ایسی تربیت کرے کہ وہ سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہو۔ اس کے اعمال و کردار پر نظر رکھے اور جہاں دیکھے کہ وہ راستہ سے بھٹک رہی ہے فوراً انہیں ٹوکے اور صحیح راہِ عمل اختیار کرنے کی تنبیہ کرے۔ حضرت نوحؑ سے لے کر محمد الرسول اللہ تک ہر نبی نے ایسا ہی کیا۔ قرآن کریم میں ہے۔ "اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا، وہ الگ ایک کنارہ پر کھڑا تھا (نوحؑ نے کہا) بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھی نہ بنو۔ (۱۱/۴۲)" پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو نصیحت فرمائی۔ "ابراہیمؑ نے اپنی اولاد اور پھر یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو یہی وصیت کی تھی کہ میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لئے اس دین کو منتخب کیا ہے لہٰذا تم صرف اسی حالت میں موت سے ہمکنار ہونا کہ تم اس کے پورے پورے مطیع و فرمانبردار ہو" (۲/۱۳۲)۔ یہی سنت حضرت لقمانؑ نے ادا کی۔ قرآن کے الفاظ میں "یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کی ہستی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔" حضرت زکریاؑ نے جہاں بیٹے کی پیدائش کی دعا مانگی وہاں ساتھ ہی یہ دعا بھی کی کہ "خدایا مجھے ایک مددگار عطا فرما دے جو میرا اور اولاد

یعقوب کا وارث ہو اور خدایا اسے پسندیدہ صورت و سیرت کا مالک بنا دینا" (۱۹/۶) حضرت مریمؑ کی والدہ نے بچی کی پیدائش کے بعد بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا تھا "میں نے اپنی بچی کا نام مریم رکھا ہے۔ خدایا! میں اس بچی کو اور اس کی اولاد کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں" (۳/۳۵) قرآن کریم آیا تو حضورؐ نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے پوری انسانیت پر یہ فریضہ عاید کرا دیا گیا "عباد الرحمٰن (اللہ کے نیک بندے) وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایسی بیویاں (شوہر) اور اولادیں عطا فرما جن سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو اور ہمیں ان لوگوں کا "امام اور پیشوا" بنا جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرنا چاہتے ہیں" (۲۵/۷۴)

حضرات انبیاء کرام نے یہ دعائیں اس لئے مانگی تھیں (ان حسین آرزوؤں اور خواہشات کا اظہار اس لئے فرمایا تھا) کہ انسانیت کی صلاح و فلاح اسی پر منحصر ہے کہ آئندہ نسلیں صحیح بنیادوں پر اٹھیں کیونکہ انسانیت مسلسل ارتقائی منازل و مدارج طے کرتی چلی آرہی ہے اس لئے آئندہ بھی اُسے یہ منازل بہرحال طے کرنی چاہئیں۔ یہ ارتقاء تدریجاً ہوتا آرہا ہے اور تدریجاً ہی ہوتا ہے۔ ہر دور کی ایک منزل ہوتی ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج کی نسل کے وہ امکانات نہیں ہو سکتے جو کل آنے والی نسل کے لئے ہوں گے۔ اگر ہماری آنے والی نسل اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان حدود سے آگے قدم نہ بڑھا سکی جن حدود تک ہم آکر رک گئے تھے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت کا ارتقاء رک گیا اور وہ ایک نقطہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں ایسی زندگی جہنم کی زندگی ہے۔ ہر موجودہ نسل کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تربیت کر کے اس کی صلاحیتوں کو اتنا اُجاگر کر دے کہ وہ انسانیت کی اس گاڑی کو اس منزل سے آگے لے جا سکیں جہاں موجودہ نسل اُسے چھوڑ رہی ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم نہ صرف پوری انسانیت کے مجرم ہونگے بلکہ انسانیت کو جہنم کے اس غار میں دھکیلنے کے موجب بنیں گے جہاں وہ رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آنے والی نسل کو صحیح تربیت نہ دینا اور اس کی صلاحیتوں کو اجاگر نہ کرنا قرآن کریم کی اصطلاح میں "نسل کشی" کہلاتا ہے۔ اور نسل کشی کرنا نہ تو انبیاء کرامؑ کی سنت ہے اور نہ ہی شیوۂ مومن۔ یہ کام تو "فرعون" نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ جس کا انجام ہمارے سامنے ہے۔

احکامِ خداوندی اور سنتِ انبیاءؑ سے یہ امر نکھر کر اور ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ تعمیرِ ملت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے ہر رسولؐ نے پہلے تعمیرِ ملت کی ہے۔ اور تعمیرِ ملت کے بعد حکومتِ خداوندی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اگر تعمیرِ سیرت و کردار سے پہلے ہی خدائی نظامِ مملکت قائم کر دینا ممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو میدان تیہ میں چالیس برس اور خود نبی اکرمؐ کو مکہ معظمہ میں تیرہ سال صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ انبیاء کرام نے ملت کی تعمیر سے حسن پیکر افراد بنائے تھے اور پھر جہدِ مسلسل سے اپنے اعمال و کردار کے نتائج میں خدا کے وعدہ کے مطابق خطۂ زمین حاصل کر کے نظامِ خداوندی قائم فرمایا تھا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہمیں یہ سرزمین (پاکستان) قرآنی تربیت اور اعمالِ حسنہ کے نتائج میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ ہم پر یہ انعامِ خداوندی تھا جو زبانی دعوائے ایمانی پر بطور آزمائش ہمیں عطا کر دیا گیا۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ خدا کے اس انعام پر ہم سجدہ شکر بجا لاتے اور اس آزمائش میں پورے اتر کر خود کو اس انعام کا مستحق قرار دے لیتے اور جو چیز غلامی کی زندگی میں ہم سے ممکن نہ ہو سکی، آزادی ملنے کے بعد ہم اپنی تمام تر توجہات کو اس پر مرکوز کر دیتے۔ ہم نے یہ بھی نہ کیا (کیا تو یہ کیا) کہ مستقل اقدارِ انسانیت کو نظامِ کہن کی بوسیدہ یادگاریں قرار دے کر انہیں ٹھکرا دیا اور اخلاقی ضوابط کو عہدِ جاہلیت کے مٹنے والے نقوش کہہ کر ان کی ہنسی اڑائی۔ "نظامِ کہن" کے آئین تو اس طرح ختم کر دیئے گئے لیکن اس کی جگہ ہم نے اس ہنگامی اسلوبِ معاشرت کو اختیار کر لیا جو جنگِ عظیم کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا اور اب یہ

ہنگامی اسلوب ہماری بساطِ سیاست کے ہر گوشے پر چھا گیا ہے۔ محبت، عقیدت، اخلاص، مروت، اخوت غرضیکہ شرفِ انسانیت کی تمام سوتیں اس نے خشک کر دیں اور ان کی جگہ خود غرضی، فریب دہی، مطلب پرستی، بددیانتی، منافقت اور بے ایمانی کے کثیف اور پُر عفونت گندے نالے بہنے لگے۔ اب معاشرہ کی حالت اس مقام پر آپہنچی ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو عجب نہیں کہ ہم اس عہدِ تاریکی میں جا پڑیں جہاں انسان علم و تہذیب اور آئین و ضوابط کے دور سے پہلے تھا اور ہماری زندگی انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانیت کی درندگی کی سطح پر جا پہنچے۔

قوم انسانی پستی کے ایسے اسفل درجے تک پہنچ چکی ہے لیکن مقامِ صد حسرت و ہزار عبرت ہے کہ ساری قوم میں کوئی ایک خدا کا بندہ بھی ایسا نہ نکلا جو بربادی اور ہلاکت کے اس تباہ کن انجام کا احساس کر کے قوم کے دھارے کا رخ بدلنے کی فکر کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بُری طرح بانجھ ہو چکی ہے دراس نے انسان پیدا کرنے ہی بند کر دیئے ہیں۔ قوموں کی تباہی اس وقت مقدر ہو جاتی ہے جب ان میں صاحبِ بصیرت باقی نہ رہیں۔ یعنی وہ جو آنے والے خطرات کو وقت سے بہت پہلے بھانپ لیں اور ساعتِ ہلاکت سے پہلے ان خطرات کے سدباب کی فکر کریں۔ ہمارے ہاں نہ کوئی ایسا صاحبِ فکر نکلا جو یہ سوچ سکے کہ قوم کی یہ حالت کیوں ہو گئی۔ اور نہ کوئی ایسا صاحبِ عمل جو اس بے راہ ہجوم کا ہاتھ پکڑ کر سیدھے راستے پر لگا سکے۔ سارے ملک میں لے دے کے ایک طلوعِ اسلام کی آواز تھی (اور ہے) جو صحرا میں کھڑے ہوئے اس کارواں کے منتشر افراد کے لئے بانگِ درا تھی۔ لیکن فقدانِ وسائل کی وجہ سے وہ پکار اتنی نحیف اور صحرا کی ویرانی اتنی وسیع کہ وہ نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی۔

صاحبانِ فکر و بصیرت کے اس فقدان کے بعد اگر ہماری نگاہیں کسی جانب اٹھتی ہیں تو وہ ملک کا وہ طبقہ ہے جو صاحبِ ثروت و اقتدار ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید زمانے کے تقاضے انہیں وقت کی اس اہم ترین ضرورت کی طرف متوجہ کر دیں گے لیکن یہ دیکھ کر ہماری نگاہ نامراد، ناکام و مایوس ہو کر کاسۂ چشم میں واپس آجاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ طبقہ زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہوتا، اس نے اپنے تقاضوں کی تکمیل کے لئے زمانے کو متاثر کرنے کی سعیٔ لاحاصل شروع کر دی۔ اس نے کیا تو یہ کیا کہ یہاں دین و دنیا میں ثنویت کا وہی بیج بو دیا جو آج سے کچھ پہلے یورپ نے مذہب سے تنگ آکر بویا تھا۔ انہوں نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر کے دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے شروع کر دیئے۔ ہمارے سابقہ حکمرانوں نے بھی "خود ساختہ" مذہب کے اجارہ داروں سے خوف کھا کر انہیں مذہبی مدارس اور دار العلوم بنانے کی نہ صرف کھلی چھٹی دے دی بلکہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے انہیں مالی امداد بھی دی اور ان کی ہمت افزائی بھی کی۔ ان مذہبی مدارس اور دار العلوموں کے فارغ التحصیل "علماء" حضرات کو اسلام سے متعلق کتنی معلومات اور واقفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہم "منیر کمیٹی" کی تحقیقات کے دوران لگا چکے ہیں کہ جب متعدد "علماء" سے پوچھا گیا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" تو ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا اور جنہوں نے جواب دیا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندر "اسلام کے تنزل کے آخری سنگِ میل کی حیثیت سے" نصب اور کندہ ہے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیج کر کیا جا سکتا ہے کہ "اسلام کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے" ان کے جوابات بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتب اور دار العلوموں میں، جن پر اس ملک کے عوام کا کروڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علم کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں اور وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) سے ہو اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ مساجد کی امامت کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ، یا

نمازِ جنازہ پڑھا دی جائے۔ جمعہ یا عیدین کا خطبہ دے دیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو "علماء" اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق سے متعلق فتوے دے سکیں۔ اور آخری درجہ یہ کہ (جو تقریر کرنی جانتے ہوں) وہ دوسرے فرقہ کے "علماء" سے مناظرہ کر سکیں۔ یا پھر (خود ساختہ طور پر) اس اختیار کے مالک بن بیٹھیں کہ ہر شخص کو مسلم یا کافر، مومن یا مرتد ہونے کے سرٹیفکیٹ جاری کیا کرتے رہیں۔

مفتی محمد عبدہؒ مصر کے نامور عالم گزرے ہیں یہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے وہ جامعہ ازہر کے متعلق، جو اسلامی دنیا میں مذہبی علوم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے لکھتے ہیں۔ "جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی مناسبت مفقود ہوتی جاتی ہے"۔　　(تفسیر المنار جلد اوّل ص۱)

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنے دوست علماء کرام کے متعلق فرماتے ہیں:-

"علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہارِ نفرت تو ان سے جتنا چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی و عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں، اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر اور ان کی تحریریں پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو"۔
(تنقیحات ص۲۰۰)

دوسری طرف حکومتوں نے کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے اسکول کالج اور یونیورسٹیاں کھولنی شروع کر دیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایسے مدارس قومیہ کا اجراء جن میں یورپ کے جدید ترین اصولوں کے مطابق تعلیم دی جائے، قوم کے اخلاق کو شائستہ بنا دیں گے اور ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کر دیں گے۔ اور یہی ان کی بنیادی غلطی تھی۔ اوّل اس لئے کہ ایک نوزائیدہ مملکت کے سامنے ایسی سست رفتار تجویزوں کا وقت نہیں آتا۔ اور اگر بالفرض حکومت قوم کے بعض افراد کو علوم و معارف سے متعارف کرانے میں کامیاب بھی ہو جاتی تو کیا یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا تھا کہ اس سے قوم کو کوئی حقیقی فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری قوم کے افراد ان علوم و معارف کی کنہ و حقیقت سے بے خبر و لاعلم بیٹھے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان علوم و معارف کا تخم کس طرح بویا گیا؟ کس پانی سے اس کی آبیاری کی گئی؟ کس طرح وہ بیج پھلا پھولا۔ ان کی تحصیل سے کن ثمرات اور نتائج کے ظہور میں آنے کی امید ہے؟ ایک تنزل یافتہ قوم کے افراد علومِ جدیدہ حاصل کر کے عالم اور محقق نہیں بلکہ ناقلانِ علوم بنتے ہیں کیونکہ اپنی قوم کے توہمات عہدِ طفولیت سے ان کی طبائع میں راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اور جس اجنبی قوم سے انہوں نے علوم و معارف حاصل کئے ہوں، اس کی عظمت کا سکہ اس قدر ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے کہ ان کا وجود مزاجِ قومی کو اور فاسد بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس قسم کا تعلیم یافتہ طبقہ اگر بالفرض قوم اور وطن کی سچی محبت رکھتا بھی ہو جب بھی وہ اپنے [illegible] فکری کے بغیر اپنی تعلیم کا ماحصل دوسروں تک اسی طرح پہنچائیں گے جس طرح انہوں نے اپنے استادوں سے سنا۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ علوم و معارف ایک اجنبی قوم سے حاصل کئے ہیں اور جس کا سرچشمہ خود ان کے سینوں میں موجزن نہیں ہوا۔ وہ اپنی قوم کی طبعِ فطری اور ان کی عادات و جذبات اور احساسات کا لحاظ نہیں کر سکیں گے۔ ان کے قصورِ نظر کی وجہ سے ماضی اور مستقبل کے خط و خال ان کی نظروں سے محجوب رہیں گے۔ ان کی نظر

تعلیم کے ظواہر تک محدود رہے گی۔ اس تمام خرابی کا اصل الاصول اور علت العلل صرف یہ ہے کہ یہ لوگ علمائے حقیقی نہیں بن سکتے۔ ان میں جو درحقیقت ملّت اور وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کی مثال ایک مشفق ماں کی سی ہے جسے ایک خاص غذا لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی مادرانہ شفقت سے اپنے بچوں کو وہ غذا پیٹ بھر کر کھلا دینا چاہتی ہے لیکن وہ بچہ شیر خوار اپنی قوت ہاضمہ کمزور ہونے کے باعث اس غذا کو ہضم نہیں کر سکتا۔

ترکوں اور مصریوں نے یورپ کے جدید ترین طرز کے مطابق کئی مدارس کھولے۔ لیکن کیا ترکوں اور مصریوں نے باوجود ایک طویل مدت گزر جانے کے اس سے کچھ فائدہ اٹھایا یا حاصل کیا؟ کیا ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی؟ کیا ان کا فقر و فاقہ دور ہو گیا؟ ان کی دولت و ثروت زیادہ ہو گئی؟ کیا انہوں نے اجنبیوں کے طرزِ حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا؟ کیا وہ اپنے قلعوں اور سرحدوں کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں کامیاب ہو گئے تاکہ اغیار و اجانب ان کے ملک میں داخل نہ ہو سکیں؟ کیا وہ اس قدر عاقبت اندیش ہو گئے ہیں اور کیا ان میں اتنی قابلیت اور صلاحیت اس تعلیم نے پیدا کر دی ہے کہ اغیار کو انہیں ہڑپ کر جانے کی طمع پیدا نہ ہو؟ کیا ان میں "حب المرکزی" کا اس قدر جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کو اپنی ذاتی فلاح و عافیت پر ترجیح دیں اور اپنی جان و مال اس کے لئے قربان کر دینے میں تامل نہ کریں؟

حوادثاتِ ماضیہ اور بار بار کے تجربات اس پر شاہد ہیں کہ جو لوگ عادات و اطوار میں کسی اجنبی قوم کی تقلید اختیار کر لیتے ہیں ان میں اغیار و اجانب اور اعدا نسبتاً آسانی کے ساتھ دخل و نفوذ پا سکتے ہیں۔ ان کی ذہنیت ان اغیار و اجانب کے رسا دس کو جلد قبول کر لینے پر آمادہ بہ عمل ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام لوگوں کو حقیر گردانتے ہیں جو ان سانچوں اور ڈھانچوں میں ڈھلے ہوئے نہ ہوں۔ ان "دقیانوسی" لوگوں کے کارنامے کتنے ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہوں وہ ان کو پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دیتے۔ رفتہ رفتہ وہ قلیل افراد جن کے دلوں میں غیرت اور عالی ہمتی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں وہ بھی انہی میں جذب ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ الغرض یہی مقلدین اغیار و اجانب کے لئے فتوحات کا دروازہ کھولتے ہیں اور اسی ذہنیت کے تسلط کو مستحکم بنانے کے ذرائع عمل میں لاتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے قلوب میں ان کی عظمت کا اس قدر گہرا اثر جما ہوتا ہے کہ وہ یہ تصور کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا منبع تعلیم و تربیت، کوئی دوسری ذہنیت یا کوئی دوسری طاقت ان پر غالب آسکتی ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا نتیجہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ استاد قوم کے لئے راستہ صاف کریں اور ان کی طاقت و عظمت کے گیت گائیں۔ ان حوادث اور تجرباتِ زمانہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک انسانیت سازی، تعمیر سیرت اور ارتقائے فکر ہی کا تعلق ہے، تنہا علومِ جدیدہ کی تحصیل کوئی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کا موجودہ بحران جس نے اس مملکت کی جڑ بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا، پاکستان کے دوسرے گوشوں اور معاشرہ کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں اور بربادیاں ابھر کر سامنے آئی ہیں، یہ دین و دنیا کی اسی ثنویت کا ثمرہ نہیں جس کا بیج ہم نے دارالعلوموں اور یونیورسٹیوں کی شکل میں بویا تھا۔

قوموں کی تاسیس، تشکیل، استحکام اور زندگی اور ارتقاء میں تعلیم کا کس قدر ہاتھ ہے اس کے متعلق طلوعِ اسلام اپنی پہلی اشاعت سے آج تک جو کچھ پیش کرتا آیا ہے وہ اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ طلوعِ اسلام نے ملت اور اربابِ ملت کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا۔

"قوموں کی زندگی نفس شماری سے نہیں، نفس گدازی سے ماپی جاتی ہے۔ قوموں کی ہلاکت سے یہی مفہوم نہیں ہوتا کہ ان کی نسل سے صفحۂ ارض پر کوئی متنفس باقی نہ رہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی مخصوص تصورِ حیات نہ رہے، اسباب

ذرائع اور ساز و یراق، اس تصورِ حیات اور آئینِ زندگی کے تحفظ کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ مقصود بالذات۔ اگر یہ تصورِ حیات ہی باقی نہ رہے تو پھر اجسام کی حفاظت ایسی ہی ہے جیسے کسی نیام بے شمشیر کی حفاظت۔ اصل قیمت گوہر کی ہے نہ کہ صدف کی۔ بلا تصورِ حیات زندگی ایک جسدِ بے روح ہے جس کی اگر حفاظت کی بھی جائے تو سوائے اس کے کہ وہ ممی خانوں کی زینت بن جائے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ حیوانوں اور انسانوں میں فرق ہی یہ ہے کہ حیوان محض اپنے جسم کو زندہ اور متحرک رکھنے کی خاطر زندہ رہتا ہے اور انسان زندگی کی حفاظت اس لئے کرتا ہے کہ یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر وہ مقصد ہی سامنے نہ رہے تو پھر انسانی زیست اور حیوانی تگ و تاز میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ دنیا میں کوئی قوم حیوانی سطح پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے افراد بے شک چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ نیام ہوتے ہیں بے شمشیر، وہ صدف ہوتے ہیں بے گوہر، وہ الفاظ ہوتے ہیں بے معنی۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ کہ جس کا جی چاہے، انہیں ایک سبز شاخ دکھا کر جدھر جی چاہے لے جائے۔ یاد رکھئے! انسان کبھی جسم کی خاطر جان نہیں دیتا کہ جان دینے سے جسم باقی نہیں رہتا۔ وہ جان دیتا ہے جسم سے کسی بلند مقصد کے لئے۔ لہٰذا جس مقصد کی خاطر انسان جان جیسی متاعِ عزیز و گراں بہا تک قربان کر دیتا ہے، اس کے تحفظ کے لئے وہ اور کس قربانی سے ہچکچائے گا! یہ ہے وہ جذبہ جو دنیا میں، قوموں کی زندگی کا ضامن ہوتا ہے اور یہی ہے وہ جذبہ جو آج ہماری قوم کے دلوں سے مفقود ہو چکا ہے۔"

صرف 'علومِ جدیدہ کی تحصیل کے انجام و عواقب کی تصویر طلوعِ اسلام نے ۱۹۵۶ء میں اس طرح کھینچی تھی۔ اب دیکھئے کہ یہ طلوعِ اسلام کا خواب تھا یا یہ وہ فلم تھی جسے ایک مفکر نے قرآن کریم کی روشنی میں انجام سے پہلے فلما دیا تھا اور آج جسے ہم پردۂ عبرت پر بحسرت و یاس دیکھ رہے ہیں۔ اسی فلم کا ایک شوٹ ۱۹۵۸ء میں دکھایا گیا جس کی تمہید یہ تھی۔

"اس دفعہ جوں جوں برسات کا موسم گزرتا جا رہا ہے لوگوں کو اطمینان کا سانس آ رہا ہے کہ امسال ملک اس سیلاب سے محفوظ رہا ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے عالمگیر تباہی کا موجب بنتا چلا آ رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کا دریاؤں کے سیلاب سے محفوظ رہنا ہزار موجبِ خیر و برکت ہے لیکن جن لوگوں کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہوئی ہے ان کی نگاہیں ایک اور سیلاب کو دیکھ رہی ہیں جو ملک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جس کی تباہ کاریاں دریاؤں کے سیلاب سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی سطح پر آتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب زندگی کی گہرائیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ دریاؤں کا سیلاب بارش کے پانی سے امنڈ آتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کے چشمے انسانی قلوب سے ابلتے ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب موجودہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے لیکن دوسرے سیلاب کی تلاطم خیزیاں آنے والی نسلوں تک کو محیط ہوتی ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی فصلوں کو بہا لے جاتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب دل کی کھیتیوں کو ویران کر دیتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب سے ایسی وبائیں پھوٹتی ہیں جن سے انسانوں کے جسم ہلاک ہوتے ہیں لیکن اس دوسرے سیلاب سے پیدا شدہ جراثیم سے قوم کی روح میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب کا اثر ایک آدھ موسم تک رہتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب میں قوم کی قوم ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ دوسرا سیلاب کون سا ہے جس کی تباہ کاریاں اس قدر شدید، وسیع اور گہری ہیں! یہ سیلاب ہے قوم کے نوجوانوں کی آوارگی جس کی لپیٹ میں اس وقت ہمارا ملک بری طرح آ چکا ہے۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔ خود ان کے ماں باپ ان کے ہاتھوں نالاں ہیں، معاشرہ ان کی حرکات سے لرزاں و ترساں ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سیلاب کا علاج کیا کیا جائے؟"

اس سیلاب کے اسبابِ وعلل اور اس کے واحد طریقِ علاج پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اس سے بہت پہلے

سنہ ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا:۔

"ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائیت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰ، حضرت ہارونؑ، اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ سے کہہ دیا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ بن جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے ابھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ رونا ہے اس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں گوارا نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی آئی تو یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دیتی لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں بھی اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فیصد دکھا دیجئے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے۔ لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی اسی قسم کی اس کی زندگی ہو گی اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہو گا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرم عمل رہے گا۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر "انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار" ہے اور بس۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لٹیروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمارے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کس طرح ہوئی اور صحیح تعلیم اس کا علاج کس طرح کرے گی؟ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کو حدود کے اندر رکھنے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ ایک کو کنٹرول (CONTROL) کہہ لیجئے اور دوسرے کو ڈسپلن (DISCIPLINE)۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر خارج سے پابندیاں عاید کی جائیں اور انہیں ان پابندیوں پر مجبور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان پابندیوں پر اس وقت تک عمل پیرا رہتا ہے جب تک وہ ایسا کرنے پر مجبور رہے۔ جونہی جبر کی

گرفت کمزور ہوگئی، پابندیاں ڈھیلی پڑنی شروع ہوگئیں۔ اس کے برعکس ڈسپلن ہے جس میں انسان اپنے آپ پر خود پابندیاں عاید کرتا ہے وہ ان پابندیوں کی ضرورت دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی اہمیت اس کے اعماقِ قلب سے ابھرتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان پابندیوں کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھے۔ جو پابندیاں اس طرح عاید کی جائیں یعنی وہ (SELF-IMPOSED) ہوں، انسان انہیں کبھی نہیں توڑتا۔ قرآنِ کریم کی صحیح تعلیم زندگی کی بلند اقدار کو اس طرح ابھار کرتی ہے کہ انسان انہیں علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا اور دل و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار میں ڈسپلن پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی آوارگی (انارکی) پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہی ہے وہ تعلیم جس کی طرف ہم شروع سے توجہ مبذول کراتے چلے آرہے ہیں اور جس سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے معاشرہ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔"

یہی آواز طلوعِ اسلام مسلسل ہر سال بلند کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں اس نے نہایت وضاحت کے ساتھ اسے بطور پیش کیا۔ اس نے لکھا:
"حیوانی زندگی کے تحفظ اور بقا کا ذریعہ خوراک ہے۔ لیکن جس چیز سے انسانی زندگی محفوظ رہتی اور آگے بڑھتی ہے، وہ ہے — صحیح تعلیم — اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم تعلیم کے مسئلہ کو بار بار کیوں سامنے لاتے ہیں اور اس کی تکرار سے نہ اکتاتے ہیں نہ گھبراتے۔ ہم اسے بار بار سامنے لائیں گے اور ایسا کرنے سے نہ اکتائیں گے نہ گھبرائیں گے اس لئے کہ اس کا تعلق ہماری انسانی زندگی سے ہے اور انسانی زندگی کی قیمت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہے۔"

مسئلہ تعلیم کی بنیاد وہ ہوتا ہے وہ مقصد جس کے لئے تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم ہزار فلسفیانہ گفتگو کریں، اس حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ اس وقت تک ہمارے سامنے تعلیم کا مقصد وہی ہے جس کے لئے انگریز نے یہاں تعلیم کا سلسلہ رائج کیا تھا۔ وہ تعلیم اس لئے دیتے تھے کہ لوگوں کو ملازمت کے لئے تیار کریں اور لوگ تعلیم اس لئے حاصل کرتے تھے کہ انہیں ملازمت مل جائے۔ یہی مقصد اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ آپ طالب علم سے پوچھئے یا ان کے والدین سے، آپ کو اس سوال کا جواب ایک ہی ملے گا اور وہ یہ کہ تعلیم سے ان کا مقصد ہے حصولِ معاش۔ خواہ وہ ملازمت کی شکل میں ہو یا کاروبار کو فروغ دینے کے رنگ میں۔ طالب علم کا منتہائے نگاہ امتحان پاس کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ یہ حصولِ ملازمت کی ضروری شرط ہے۔ کامیاب طالب علم وہ ہے جو ہر سال امتحان پاس کرتا جائے اور قابلِ صد افتخار وہ ہزاروں میں ایک وہ جو امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مقاصد حیوانی سطحِ زندگی سے متعلق ہیں انسانی سطح کا اس میں نام تک نہیں آتا۔ یعنی دیکھا یہ جاتا ہے کہ طالب علم روٹی کمانے کے قابل ہوگیا ہے یا نہیں، یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ انسان بننے کے قابل بھی ہوگیا ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم حصولِ معاش میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، اور اسے ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن ہم جس بات کا رونا رو رہے ہیں وہ یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد معاش حاصل کرنا بن چکا ہے انسان بنانا نہیں، ہماری تعلیم تعلیم نہیں محض ایک ہنر ہے۔ ناخواندہ مستری کہلاتا ہے، تعلیم یافتہ انجینئر۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ وہ سو روپے ماہوار کماتا ہے یہ ہزار روپے۔ جہاں تک انسان ہونے کا تعلق ہے (جرأت عرض معاف) اکثر صورتوں میں وہ مستری اس انجینئر سے چند قدم آگے نظر آئے گا۔ یہ مقصد ہے تعلیم حاصل کرنے والوں کا۔ باقی رہے تعلیم دینے والے تو ان کے پیشِ نظر مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے انجینئر پیدا ہوں کیونکہ ملک کو انجینئروں کی ضرورت ہے۔ ان کے سامنے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہمارے پاس ایسے انجینئر پیدا ہوں جو اچھے انسان بھی ہوں۔ یہ ہے بنیادی نقص ہماری تعلیم کا۔ اس کا مقصد انسان سازی نہیں ہنر آموزی ہے۔ ہنر آموزی کے لئے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ طالب علم کی معلومات (INFORMATION) میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس کا علم (KNOWLEDGE) بڑھا دیا جائے۔ لیکن تعلیم (EDUCATION) سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو یہ سکھایا جائے کہ وہ اپنے علم (KNOWLEDGE) کو

استعمال کس مقصد کے لئے کرے — دنیا کی مہذب ترین قومیں جن کے سامنے حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں سے بلند کوئی مقصد نہیں ان کی حالت بھی ایسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ (LEWIS MUMFORD) امریکہ کے متعلق لکھتا ہے۔

"ہم نے یہاں ایک نئی نسل پیدا کی ہے، عمدہ توانائی، خوبصورت جسم لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ مہذب وحشی نوجوان حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل لے رہے ہیں کبھی بیکار جنسی میلان کے تحرک سے ناچنے لگتے ہیں۔ یہ اپنے لباس کے بارے میں بہت محتاط ہیں لیکن یہ احتیاط محض فیشن کی پابندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں — ایسی زندگی جی کر، جو اگر کامیاب ہے تو حیوانی نشاط انگیزی کی، اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی کی — حیوانی سطح اور حیوانی تسکین کے علاوہ، انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان حیوانی لذات سے محروم کر دیجئے، تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائیگا۔"

(FAITH FOR LIVING)، یہ ہے وہ پود — بلکہ اس سے بھی گھٹیا قسم کی — جسے یہاں ہماری تعلیم پیدا کر رہی ہے۔ — وہ پود کہ جو اگر ناکام ہے تو خود اپنے آپ سے تنگ ہے، اور اگر کامیاب ہے تو ان کے ہاتھوں معاشرہ تنگ ہے۔

جب ہم ان کے ہاتھوں زیادہ تنگ آ جاتے ہیں تو سوچنے لگتے ہیں کہ ان کا علاج کیا کیا جائے، چنانچہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے اسی طرح سوچا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان خرابیوں کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کیریکٹر نہیں ہے۔ پھر سوچا گیا کہ ان میں کیریکٹر کیوں نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ہماری تعلیم میں مذہبی عنصر کی کمی ہے۔ اسے پورا کر دیا جائے تو قوم میں کیریکٹر پیدا ہو جائے گا۔ نصابِ تعلیم میں مذہبی عنصر کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ سوچا گیا کہ طالب علموں کو قرآن کی آیات حفظ کرائی جائیں۔ احادیثِ مقدسہ یاد کرائی جائیں۔ اسلام — (یعنی مسلمانوں) کی تاریخ پڑھائی جائے۔ دینیات کے مسائل سمجھائے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

— آپ غور کیجئے کہ یہ تعلیم ہے یا وہی چیز جسے ہم نے شروع میں معلومات میں اضافہ کرنے سے تعبیر کیا ہے؟ صاف نظر آ جائے گا کہ یہ ایجوکیشن نہیں، معلومات افزائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی معلومات بہم پہنچانے سے طالب علموں میں وہ کیریکٹر پیدا ہو جائیگا جس کے لئے ہم نے یہ طریق تجویز کیا ہے؟ اس کے لئے ہم ایک عام بات سامنے لانا چاہتے ہیں — ہمارا روئے سخن، خاص افراد یا کسی خاص گروہ کی طرف نہیں — آپ ان طالب علموں کو مذہبی معلومات کا کچھ حصہ ہی بہم پہنچا سکیں گے۔ انہیں تمام تر معلومات کا ماہر نہیں بنا سکیں گے۔ اس کے برعکس آپ (ساری دنیا پر نگاہ ڈالئے) اور ان لوگوں کو دیکھئے جنہوں نے ان معلومات کو مکمل طور پر حاصل کر رکھا ہے۔ کیا آپ کو ان لوگوں میں وہ کیریکٹر ملتا ہے جسے پیدا کرنے کے لئے آپ اپنے نصابِ تعلیم میں یہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟ اس سے آپ یوں نہ سمجھ لیجئے کہ ہم "مذہبی تعلیم" کے خلاف ہیں — ہمارا یہ ایمان ہے کہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی خرابیوں کا علاج "دینِ اسلام" کی تعلیم میں ہے۔ لیکن "دین" کی تعلیم اور "مذہبی" معلومات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دین کی تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ طالب علموں کے ذہن نشین کرایا جائے کہ:-

۱۔ حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق کیا ہے۔

۲۔ انسانی زندگی کا مقصود (SELF DEVELOPMENT) یعنی انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

۳۔ انسانی ذات کی نشوونما، ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے، جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں، اور جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

۴۔ یہ سمجھایا جائے کہ عقلِ انسانی ان اقدار کو کیوں وضع نہیں کر سکتی اور اس کے لئے وحی کی راہنمائی کی کیوں ضرورت ہے۔

۵۔ انہیں بتایا جائے کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو اپنی اقدار کے مطابق عالمگیر انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے صرف کرے۔

۶۔ انہیں ان اقدار کی تفصیل بتائی جائے اور سمجھایا جائے کہ جو نظام ان اقدار کی حدود کے مطابق متشکل ہوگا وہ کس طرح دنیا کے تمام نظامہائے تہذیب وسیاست ومعاشرت ومعیشت کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے زیادہ نفع رسانی کا موجب ہوگا۔

۷۔ انہیں بتایا جائے کہ جب یہ نظام محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا تو اس کے انسانیت ساز نتائج سے حسنِ کائنات میں کس قدر نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

۸۔ انہیں بتایا جائے کہ انسانی ذات پر ایمان (اور اس کی نشوونما پر یقین) کے معنی یہ ہیں کہ یہ سمجھا جائے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں بلکہ یہ مرنے کے بعد مسلسل آگے بڑھتی ہے (ب)، انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات بھی اپنا نتیجہ مرتب کرکے رہتے ہیں ہر شخص کو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ اس سے کسی کو کسی حالت میں بھی مفر نہیں ہو سکتا۔ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔

۹۔ طالب علموں کو یہ بنیادی حقائق، علم کی اس سطح کی روشنی میں، علیٰ وجہ البصیرت سمجھائے جائیں جس تک ذہنِ انسانی اس وقت تک پہنچ سکا ہے۔ اس طرح انہیں ان کی صداقت کے متعلق (CONVINCE) کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اس قسم کی (CONVICTION) کو جس میں انسان کا قلب و دماغ پوری طرح مطمئن ہو جائے، ایمان کہتے ہیں۔

۱۰۔ اور پھر انہیں بتایا جائے کہ پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا کہ یہاں وہ نظام قائم کیا جائے جو قرآن کی مستقل اقدار کا آئینہ دار ہو، اور یہ ہے وہ نظام جس کے چلانے کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ملوکیت کا استبداد، سرمایہ داری کی خون آشامی اور مذہبی پیشوائیت کی اوہام پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی قسم کی زیادتی کر سکتا ہے۔ اس میں کسی کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ مستقل اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امت اپنے اور انسانیت کے مسائل کا حل (اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق) باہمی مشاورت سے دریافت کرتی ہے۔

۱۱۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس تعلیم کو کتابوں تک ہی محدود نہ رکھا جائے۔ طالب علموں کو یہ بھی بتایا جائے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں ان اقدار و قوانین کا عملاً اعلان کس طرح ہوگا۔ اس میں بھی صرف بتانے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پر کس حد تک کاربند رہتے ہیں۔ اس چیز کا ریکارڈ رکھا جائے اور امتحان کے وقت (کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ کرتے وقت) اسے خاص اہمیت دی جائے ۔۔۔ طالب علم کے متعلق یہی نہ دیکھا جائے کہ اس نے کیا پڑھا ہے، یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کیا بنا ہے۔ اس وقت طالب علم دماغ کو "نفرماس نوٹل" سمجھا جاتا ہے جس میں علم (یعنی معلومات) کا ذخیرہ جمع ہوتا رہتا ہے اور وہ انہیں عند الضرورت جوں کا توں نکال کر باہر رکھ دیتا ہے۔ اس قسم کا علم، تعمیرِ سیرت میں کسی کام نہیں آسکتا۔ طالب علم کے دماغ کو زرخیز زمین سمجھنا چاہیئے کہ اس میں جو کچھ ڈالا جائے گا وہ ساتھ کے ساتھ بڑھتا پھولتا چلا جائے اور آخر الامر اس کے برگ وبار اس تمام پروگرام کی کامیابی کی زندہ شہادت بنیں۔ اس ضمن میں اس اصول کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ مردہ تصورات جنہیں پروفیسر وائٹ ہیڈ (INERT IDEAS) کہہ کر پکارتا ہے، انسانی نشوونما کے لئے کبھی حیات بخش ثابت نہیں ہو سکتے۔ مردہ تصورات سے مراد ایسے تصورات ہیں جنہیں عملی زندگی پر منطبق نہ کیا جائے۔ طالب علم کا دل و دماغ (MIND) جامد پتھر کا نہیں ہوتا۔ وہ زندہ ہوتا ہے اور ہر وقت ان اشیاء و نتائج کی تلاش میں رہتا ہے جو اسے متحرک رکھ سکیں اور نشوونما دے سکیں۔ جب آپ اس کے (MIND) کو جامد

تصورات سے بھر دیتے ہیں تو وہ اپنی زندگی اور نشو و نما کے لئے دوسرے مقامات سے اسباب و ذرائع تلاش کرتا ہے ۔۔۔ یہ اسباب و ذرائع جہاں سے ملیں، اور جیسے ملیں، وہ لیتا چلا جاتا ہے۔"

یہ ہے ملخص اس پیغام کا جسے طلوعِ اسلام تینتیس برس سے مسلسل دیئے چلا آرہا ہے۔

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب جنہوں نے اپنی زندگی فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے اور جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں والہانہ انداز سے حصہ لیا تو اسی مقصد کے پیشِ نظر کہ جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ہو اسلام ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اس نظریہ کے عام کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں کہ یہ مملکت اسلامی قالب میں ڈھل نہیں سکتی جب تک قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کچھ عرصہ قبل یہ تجویز پیش کی کہ ایک اپنا کالج کھولا جائے جس میں قرآن اور علومِ حاضرہ کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ اس کے فارغ التحصیل طالب علم نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے قرآنی نظامِ زندگی کو مشرق اور مغرب دونوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوں۔ اس کالج میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدوں کے مطابق ہو کہ وہاں کا طالب علم زندگی کے شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے لیکن اس میں یہ مضامین اس انداز سے پڑھائے جائیں جسے گزشتہ صفحات میں وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی گئی جسے حکومتِ پاکستان سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے پیشِ نظر سب سے پہلا مرحلہ زمین کے حصول کے لئے سرمایہ کی فراہمی تھا۔ سوسائٹی نے یہ مرحلہ ایک قلیل مدت میں انتہائی سرگرمی سے طے کر لیا اور زمین کی خرید کے لئے اگلا قدم بڑھا دیا۔ یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ کافی حوصلہ شکن آزمائشوں اور ہنگامی مشکلات کے بعد زمین کے حصول کے امکانات روشن تر ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد سوسائٹی کا آئندہ قدم کالج کی تعمیر ہوگا جس کے لئے دامے، درمے قوم کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ وہ حضرات جو اس قرآنی فکر سے ہم آہنگ اور تعلیم و تربیت کے لائحہ عمل سے اصولاً متفق ہیں، یہ اب ان کا کام ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ واقعی اس مملکت میں قرآنی نظام کو عملاً متشکل دیکھنے کے آرزومند ہیں تو وقت آگیا ہے کہ "نحن انصار اللہ" کہہ کر اس کی تعمیر میں حصہ لیں۔ مسلمانوں نے اپنے اپنے فرقوں کی "مسجدیں تکاہیں" تو قدم قدم پر بنا کر کھڑی کر دی ہیں جو مرکزِ توحید ہونے کے بجائے امت میں تفرقہ اور انتشار کی افزائش گاہیں بن رہی ہیں۔ جو حضرات صحیح معنوں میں ملت کو توحیدِ خداوندی کا پیکر دیکھنا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ سب مل کر ایک ایسی "صلوٰۃ گاہ" تعمیر کریں جس کا نمازی جب سجدہ میں جائے گا تو ساری کائنات کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا پڑے۔ یہ سوچ لیں کہ ان پر اس وقت کتنی عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ اپنی بے سروسامانی سے مت گھبرایئے۔ آپ کے دعوے کی صداقت، آپ کی نیتوں کا خلوص، آپ کے عزم کی پختگی، آپ کے عمل کی مداومت، آپ کے ذرائع کی کمی کو پورا کر دیگی۔ خدا کا کائناتی قانون آپ کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے ۔۔۔ آپ کے اس حسنِ عمل سے ایک ایسے نقطہ کا آغاز ہو جائے گا، جو آخر الامر ساری دنیا میں قرآنی فکر کے عام کرنے اور قرآنی نظام قائم کرنے کا محیط افزا دائرہ بن جائے گا! اور اس طرح آپ "السابقون الاولون" بن جائیں گے جن کے پیچھے کاروانِ انسانیت رشد و سعادت کی اس راہ پر گامزن ہو جائیگا جو کامرانیوں اور خوشگواریوں کی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ قرآن نے آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں، ہم نے دیارِ عشق میں اپنے مقام کا تعین کر لیا ہے اور نیا زمانہ اور نئے شام و سحر ہمارے قدم چومنے کو آگے بڑھ رہے ہیں۔

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

(طلوعِ اسلام)

از: علامہ محمود شلتوت
سابق ریکٹر الازہر یونیورسٹی - مصر

ترجمہ: رضیع اللہ
ایم۔ اے

شریعتِ اسلامی اور موسیقی

(مغربی علوم کی ترویج کے ساتھ، مسلمانوں میں تجدد پسند طبقے کے وجود میں آجانے سے ہمارے ہاں قدیم وجدید کی ایک ایسی کشمکش پیدا ہو گئی جو مجموعی لحاظ سے امتِ مسلمہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہونے لگی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے روشن خیال اہل علم نے اس خطرناک صورتِ حالات کو محسوس کیا۔ اور انہوں نے جدت پسند اور قدامت پسند طبقات میں جو بُعد المشرقین تھا اسے حتی الامکان کم کرنے کی کوشش کی۔ انہی میں سے ایک مشہور ہستی علامہ محمود شلتوت مرحوم سابق ریکٹر الازہر یونیورسٹی کی ہے۔ وہ نہ صرف مصر میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں قدامت پسند اور تجدد پسند گروہوں میں برابر کے مقبول تھے۔ علمائے مصر نے آپ کو "الامام الاکبر" کا خطاب دیا۔ ہمارے ہاں بھی ہر طبقہ (بشمول جماعت اسلامی) کے اہل علم آپ کی تحریروں اور فتاویٰ کو بطور سند پیش کرتے رہتے ہیں۔ (مثلاً ملاحظہ ہو ضبطِ تولید کی شرعی حیثیت مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور صفحہ ۱۳۶)

ہمارے ہاں دوسرے اور تیسرے درجے کے علمائے مصر کی تحریروں کے تراجم تو بڑی آب و تاب سے پیش کئے جاتے ہیں لیکن اس دور کے الامام الاکبر کی نگارشات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حالانکہ امام موصوف کے فتاویٰ ساری اسلامی دنیا میں مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ کسی مسئلے کے بارے میں ان کا فتویٰ دینے کا اسلوب بہت ہی پیارا ہے۔ پہلے تو وہ زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسئلہ زیرِ نظر پر قرآنِ حکیم کی روشنی میں علمی و عقلی بحث فرماتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی تائید میں اجل فقہا کے فیصلے نقل کرتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم ان کے ایک اہم ترین فتویٰ کا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ مترجم)

السوال ہمارے پاس ایک نوجوان کا خط آیا ہے جس میں وہ موسیقی سے اپنے لگاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ وہ کافی محنت سے اسے سیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے ایک دوست نے بتایا کہ لہو ہونے کی وجہ سے یہ شریعتِ اسلامی میں حرام ہے کیونکہ لہو انسان کو عبادتِ الٰہی سے غافل کر دیتا ہے۔ موسیقی کا علم حاصل کرنے والے اس نوجوان نے اپنے دوست سے کہا کہ میں نماز پنجگانہ کا سختی سے پابند ہوں اور عبادتِ الٰہی سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ صرف فرصت کے اوقات میں دن بھر کی محنت اور تھکاوٹ کے اثرات دور کرنے کے لئے اس کا شوق کرتا ہوں لیکن اس کے دوست نے اس وضاحت کو کافی نہ سمجھا بلکہ وہ برابر اصرار کرتا رہا کہ موسیقی ہر حالت میں حرام ہے۔ آخر کار یہ رائے ہوئی کہ اس بارے میں شرعی حکم معلوم کر لیا جائے جس کے لئے اس نوجوان نے ہمیں یہ خط لکھا ہے۔

الجواب: ایک ہی چیز حرام بھی ہو اور حلال بھی؟

میں امید رکھتا ہوں کہ میرے مسلمان بھائی اس فتوے کے ذریعے ان چیزوں

کی شرعی حیثیت کے متعلق کہ جنہیں بعض لوگ حرام قرار دیتے ہیں اور بعض حلال، خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل کہ ایک ہی چیز ایک گروہ کے نزدیک حلال ہے اور دوسرے کے نزدیک حرام عامۃ الناس کے لئے خاصا پریشان کن مسئلہ ہے اور اس صورتِ حالات نے ان پر غیر صحت مندانہ نفسیاتی اثر ڈالا ہے کیونکہ ان کی علمی حیثیت اتنی نہیں ہوتی کہ وہ خود ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں اس لئے وہ ہمیشہ ان چیزوں کی حلت و حرمت کے بارے میں متردد رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی پریشان کن حالت ہے جو کسی صورت مومنوں کے شایانِ شان نہیں۔

انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ موسیقی کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔ اور جیسا کہ ان مسائل کے بارے میں ہم اصولاً بیان کر چکے ہیں اس کی حلت و حرمت کے بارے میں بھی دو متضاد رائیں ہیں۔ جو فریق اس کی حرمت کا قائل ہے، بعض دینی کتابوں میں ایسے اقوال ان کی نظر سے گذرے ہیں یا وہ متقی لوگوں کی زبانی ایسا سنتے ہیں۔ ایسے متقی لوگوں نے اپنے تقوی کا غیر ضروری ڈھونگ رچایا ہوتا ہے۔ دوسرا فریق جو موسیقی کے جواز کا قائل ہے، وہ شریعتِ اسلامی کو عقلِ سلیم کی روشنی میں دیکھتے ہوئے انسان کے فطری جذبات کے احترام کا قائل ہے۔ پہلا گروہ بعض فقہا کے تحریر کردہ فیصلوں یا ان سے زبانی سن کر موسیقی کی حرمت کا قائل ہے جبکہ فریقِ ثانی انسان کے فطری تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے اس کے سیکھنے اور سننے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا۔

فطرتِ انسانی اور دنیاوی لذات

اس مسئلہ اور اس جیسے دوسرے مسائل جن کی حلت و حرمت کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے، کے سلسلے میں یہ اصولی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالٰی نے انسان میں ایسے جذبات پیدا کئے ہیں جو دنیاوی لذائذ اور ایسی پاکیزہ چیزوں کی طرف میلان رکھتے ہیں جن سے وہ اپنے نفس میں خوشگوار اثر محسوس کرتے ہیں اور ان کے ذریعے وہ فرحت، راحت، خوشی اور سکون حاصل کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان خوبصورت مناظر مثلاً چار سو پھیلا ہوا سبزہ، موجوں سے کھیلتا ہوا شفاف پانی اور حسین پیکروں کے نقش و نگار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ پاکیزہ ہوائیں جو جسم اور روح کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہیں ان سے اس کا سینہ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نرم و نازک چیز، جس میں کسی قسم کی سختی نہیں، کے چھونے سے بھی وہ ایک قسم کی لذت محسوس کرتا ہے اور یہاں تک کہ کسی مخفی چیز کی دریافت سے بھی اسے ایک خاص قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے جس کی کیفیت صرف اس کا دل ہی بیان کر سکتا ہے اور پھر محبت کا فطری جذبہ جو اس کے دل میں موجزن ہے، اس کی وجہ سے وہ دنیاوی لذات، بیوی بچے اور مال و دولت پر فریفتہ ہے۔

شریعت انسانی جذبات کو ختم نہیں کرتی بلکہ انہیں منظم کرتی ہے

اگر انسان محبت کے جذبات سے عاری ہوتا تو وہ شاید ہی اس دنیا میں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتا جن کے لئے اللہ تعالٰی نے اسے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ انہی مقاصد کے لئے اللہ تعالٰی نے اسے ہر قسم کے جذبات سے نوازا ہے جن سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے اور جب حکمتِ الٰہی ہی کا یہ تقاضا تھا کہ انسان جذباتِ محبت اور ذوقِ لطیف سے نوازا جائے تو پھر ان جذبات کو دبانا یا ترک کر دینا یا بالکلیہ ختم کر دینا اس حکمتِ الٰہی کے خلاف ہوگا۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی بھی آسمانی شریعت انسانی زندگی کے کسی مرحلے پر ان جذباتِ لطیفہ کو جو انسانی زندگی کا ایک اہم جزو ہیں، ختم کرنے کا مطالبہ کرے۔

ہاں شریعت ان جذباتِ لطیفہ کے لئے ایک مناسب حد ضرور مقرر کرتی ہے کہ انسان ان میں منہمک ہو کر نہ تو اپنی ذمہ داریوں سے کسی قسم کی غفلت برتے اور نہ ہی اس کے اخلاق متاثر ہوں۔ شریعت اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص زندگی کے

ضروری کاموں کو چھوڑ چھاڑ کر بس انہی لذائذ کا ہو جائے۔

میانہ روی عظیم اسلامی اصول ہے

یہ ہے جذباتِ لطیفہ کے بارے میں شریعتِ اسلامی کا موقف۔ اور ظاہر ہے کہ یہ موقف میانہ روی[1] ہے جس میں کوئی افراط تفریط نہیں۔ اور یہ کہ شریعت ان کو بالکل ختم کرنا نہیں چاہتی بلکہ انہیں مناسب طریقے سے منظم کرتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی اصول جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے اور پھر شریعت کے مقاصد سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔

(ترجمہ) اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے ہی نہ باندھ رکھو اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دو۔ (یعنی بخل اور اسراف سے بچو)

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا

(ترجمہ) اے بنی آدم ہر مسجد کے قریب تم اپنی زینت اختیار کرو اور کھاؤ پیو اور فضول خرچی مت کرو۔

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ۔

(ترجمہ) اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ اور اپنی آواز کو پست کرو۔

پس شریعت ان جذباتِ لطیفہ کو میانہ روی کی حد تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ نہیں چاہتی کہ انسان کے دل سے مال کی محبت کا جذبہ سرد کر دیا جائے۔ اس کے برعکس اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مال میں تصرف اس طور ہو کہ نہ تو وہ کنجوسی کی حد کو چھوئے اور نہ ہی فضول خرچی کی حدود پار کر جائے۔ ٹھیک اسی طرح وہ انسان میں فنونِ لطیفہ کے جذبات کو ختم کرنا نہیں چاہتی اور انسان کو پاکیزہ مناظر کی محبت اور لذت بخش نغمات کے سننے سے نہیں روکتی۔ بلکہ وہ ان جذبات کو مہذب بنانے کی ہوتی مطالبہ کرتی ہے کہ یہ جذبات کسی نقصان یا شر کا سبب نہ بن جائیں۔ اسی طرح وہ جذباتِ غم کو ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کرتی، بلکہ اس میں بھی میانہ روی کی تعلیم دیتی ہے کہ بہت زیادہ جزع فزع کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ تمام فطری جذبات کے ساتھ شریعت کا طرزِ عمل اپنی بنیادوں پر ہے۔

عقل اللہ تعالیٰ کی حجت ہے

عقل، جو بندوں پر اللہ تعالیٰ کی ایک حجت ہے، کو ذاتِ باری تعالیٰ نے اس امر کا مکلف کیا ہے کہ وہ ان جذباتِ لطیفہ کو شرعی اور دینی حدود کے اندر منظم کرے۔ پس جب کوئی انسان کسی پیاری آواز کے سننے کی طرف مائل ہو یا وہ انسان یا کسی اور ذی روح کی زبان سے لذت انگیز نغمہ سنے یا وہ موسیقی کے کسی آلہ کو سنے یا اس کا استعمال سیکھے تو اس نے اپنے جذباتِ لطیفہ کا ایک طرح سے حق ادا کر دیا۔ صرف یہ خیال رکھا جائے گا کہ اس معاملے میں اس کی مصروفیت وانہماک اس حد تک ہونا چاہیئے کہ وہ اسے دینی واجبات اور اخلاقی فرائض سے غافل کر کے اسے اسکے صحیح انسانی مرتبہ سے گرا نہ دے۔ اگر وہ ان پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے موسیقی کی طرف متوجہ ہو گا تو یوں سمجھئے کہ اسے اپنے اس جذبۂ لطیفہ پر پوری گرفت حاصل ہے اور وہ صحیح راستے پر گامزن ہے اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے گا اور نہ ہی عامۃ الناس کی خفگی کا سبب بنے گا۔

---

[1] ہر معاملہ میں میانہ روی صحیح مسلک نہیں قرار پا سکتا۔ مثلاً حق و باطل، جھوٹ اور سچ، دیانتداری اور بددیانتی وغیرہ میں میانہ روی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام)

اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ موسیقی کے بارے میں نوجوان سائل کا طرزِ عمل جبکہ وہ نماز پنجگانہ اور دوسرے دینی احکامات کی سختی سے پابندی کرتا ہے، اس کے جذباتِ لطیفہ کی آواز ہے اور جب کہ ہم واضح کر چکے ہیں عقل اس کے ان جذبات کو شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ یہ ہے وہ بہترین حل جو آسمانی شریعت لوگوں کی زندگی کے مسائل کے بارے میں پیش کرتی ہے۔

موسیقی اور فقہاء

ہمارے خیال کے مطابق تو ان تمام چیزوں کے بارے میں جن میں انسان جذباتی کشمکش محسوس کرتا ہے، یہ اصولی فیصلہ کافی ہے لیکن اکثر لوگ اس اصولی فیصلہ کو کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ حلال و حرام کے بارے میں ان کے نزدیک سرے سے ایسے اصولی فیصلے کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کی تسلی صرف اسی صورت میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے فقہاء کے اقوال پیش کئے جائیں اور جب ہمیں فقہاء کے اقوال ہی پیش کرنے ہیں تو لیجئے سنیئے کہ فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جنگ پر شوق دلانے، جہاد کی تیاری، خوشی کے مواقع مثلاً عیدین، شادی بیاہ کیلئے سفر سے واپسی پر خوشی منانے کے لئے موسیقی جائز ہے۔ ان مذکورہ بالا مواقع کے علاوہ موسیقی کا حکم کیا ہے، اس بارے میں ان فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ یہ حرام ہے۔ اپنے دعویٰ کی تائید میں وہ احادیث اور آثارِ صحابہؓ کو پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جو اسے بالکل جائز قرار دیتا ہے اور وہ بھی احادیث و آثار ہی کا سہارا لیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے کہ قرآن مجید، سنتِ رسولؐ، اور قیاس و استدلال میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو موسیقی کے آلات سے پیدا شدہ پاکیزہ آوازوں کو سننا حرام قرار دے۔ اس گروہ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ موسیقی کی حرمت کے بارے میں جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے[1]

علامہ نابلسی کی رائے

اس موضوع پر بندہ نے گیارھویں صدی کے ایک صالح اور صاحبِ تقویٰ حنفی امام شیخ عبدالغنی نابلسی کی کتاب "ایضاح الدلالات فی سماع الآلات" پڑھی ہے۔ اس میں انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ وہ احادیث جن سے موسیقی کی حرمت کا استدلال کیا جاتا ہے، اگر بالفرض انہیں صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو ان احادیث میں موسیقی کی حرمت عیش پرستی کے دوسرے لوازمات، شراب خوری، لونڈیاں اور فسق و فجور سے مقید ہے اور کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس میں یہ قید نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان احادیث میں موسیقی کی حرمت کا حکم عیش پرستی کے ان ناجائز لوازمات کی حرمت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ان لوازمات کے ساتھ موسیقی اسے حرام کی طرف لے جائے۔ لیکن جب موسیقی عیش پرستی کے ان حرام لوازمات سے بالکل محفوظ و مامون ہو تو پھر اس کا سننا، سیکھنا اور مجلسِ موسیقی میں حاضر ہونا مباح ہے یعنی شرعاً جائز ہے۔

رسولِ اکرم صلعم، صحابہ کرامؓ، تابعین، ائمہ اسلام اور فقہاء مذاہب اسلامیہ سے منقول ہے کہ وہ محرمات سے پاک مجالسِ موسیقی میں حاضر ہوا کرتے تھے اور یہی اکثر فقہاء کا مسلک ہے اور یہ مسلک ہماری اس اصولی بحث کے عین مطابق ہے جس میں ہم نے انسان کے فطری جذبات کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ کا موقف واضح کیا ہے۔

---

[1] راقم نے اسی موضوع پر اپنی کتاب میں موسیقی کی حرمت کے بارے میں پیش کی جانے والی احادیث اور آثارِ صحابہؓ کو یکجا کر کے ائمہ حدیث کی زبانی ان کا جواب نقل کیا ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ چالیس صفحات پر مشتمل ہیں اس لئے انکا یہاں نقل کرنا ممکن نہیں جن قارئین کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ راقم کی کتاب "موسیقی کی شرعی حیثیت" ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں۔ (مترجم)

شیخ العطار کا موسیقی سے شغف

علامہ شیخ حسن العطار تیرھویں صدی ہجری میں الجامعۃ الازہر کے ایک مشہور و معروف ریکٹر تھے۔ ایک مشہور اور باعمل عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی والہانہ شغف تھا۔ اور وہ خود ایک ماہر موسیقی دان بھی تھے۔ اور اس فنِ لطیف پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص دریا کے کنارے سایہ اشجار میں موسیقی کے تاروں سے چھڑنے والے لطیف نغمات سے متاثر نہیں ہوتا وہ بے حس طبیعت کا گدھا ہے۔"

موسیقی اصلاً جائز ہے اور اس کی حرمت عارضی

پس یہ مسئلہ واضح ہو کر یوں سامنے آجاتا ہے کہ سریلی، میٹھی اور پیاری آوازوں اور نغمات کو موسیقی کے آلات کے ساتھ سننا اس وجہ سے حرام نہیں ہے کہ وہ کسی انسان یا دوسرے ذی روح کی آوازیں یا وہ موسیقی کے کسی آلہ سے پیدا ہو رہی ہیں بلکہ وہ صرف اس وقت حرام ہوں گی جب انہیں حرام مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اور خاص طور پر جب وہ انسان کو اس کے فرائض دینوی و دنیاوی سے غافل کر دے۔

اور چاہیئے کہ ایسے معاملات میں احکام ربانی اسی طرح واضح کئے جائیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ ایسے اہم مسائل کی حلت و حرمت کا فیصلہ محض اندازے اور اٹکل پچو سے نہ کیا جائے گا کیونکہ ایسی چیز کو حرام قرار دے دینا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں قرار دیا یا ایسی چیز جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا ہو کو حلال قرار دے دینا' یہ دونوں ذاتِ باری پر بغیر علم کے افتراء کرنا ہے کیونکہ اس عظیم ذات نے حرام و حلال کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے ارشاد ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۔ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (سورۃ الاعراف ۔ ۳۳)

(ترجمہ) کہہ دیجئے کہ میرے رب نے ظاہری اور باطنی فواحش کو، اور گناہ کے کام اور بغیر حق کے کسی پر زیادتی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغیر دلیل کے شریک ٹھہرانا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ کچھ کہنا جس کا تمہیں علم نہیں، حرام قرار دیا ہے۔

(ختم)

نوٹ :۔ یہ فتویٰ پہلے مجلہ "الازہر" میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ان کے دوسرے تمام فتاویٰ کے ساتھ "کتاب الفتاویٰ" میں شائع کیا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام: ہمارے نزدیک اس باب میں قولِ فیصل علامہ شلتوت مرحوم کے یہ الفاظ ہیں کہ "ایسی چیز کو حرام قرار دے دینا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار نہیں دیا، یا ایسی چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو' حلال قرار دے دینا' اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے" اور موسیقی کو اللہ تعالیٰ نے کہیں حرام قرار نہیں دیا۔